# مجلس ادارت



## معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپیے فی شمارہ سات روپیے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس. ایم. کالج. اسٹریچن روڈ. کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں. بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUI MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے. اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا.

• خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں.

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی.
کمیشن ۲۵٪ ہوگا. رقم پیشگی آنی چاہیے


جلد ۱۶۲ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۹ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۹۸ء عدد ۵


فہرست مضامین

# شذرات

جب بی۔ جے۔ پی مختلف پارٹیوں کی حمایت سے مرکز میں حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئی تو چند مہینوں تک وہ اپنے اندرونی جھگڑوں میں ایسی الجھی رہی کہ کاروبارِ حکومت سنبھالنے کا اسے موقع ہی نہیں ملا، وزیر اعظم مسکین صورت بنے ہوئے تھے، چہرے سے پریشانی اور گھبراہٹ کا اظہار ہوتا تھا، ایک مرتبہ تو عالمِ اضطراب میں یہ بھی کہہ دیا کہ آیندہ وہ انتخاب میں حصہ نہ لیں گے، لیکن حلیف پارٹیوں کے بارے میں جو آئے دن سانجھے داری سے الگ ہوجانے کی دھمکیاں دے رہی تھیں، جب تجربے سے اندازہ ہوگیا کہ یہ گرجنے والے بادل برسنے والے نہیں ہیں اور مخالف پارٹیاں نہایت منتشر اور پراگندہ ہیں، ہر ہر پارٹی میں گروپ بندی ہے، ان میں یہ دم خم کہاں کہ بی۔ جے۔ پی کی کمزور حکومت کو بھی گرا سکیں تو وزیر اعظم کا چہرہ کھل اٹھا، پہلے جیسی رونق اور بشاشت لوٹ آئی، انکی رگِ ظرافت بھی پھڑکنے لگی اور اب یہ حال ہے کہ بی۔ جے۔ پی اپنے اصل منصوبہ "ہندوتوا" پر عمل کرنے کے لیے کمربستہ ہے۔

---

جب بی۔ جے۔ پی کی لڑکھڑاتی حکومت نے سنبھالا لیا اور حکومت گرنے کے سارے کھٹکے جاتے رہے تو ہم جیسے سادہ لوح یہ سمجھنے لگے کہ اب وہ اپنے وعدے کے مطابق ملک کو بنانے اور سنوارنے اور صاف ستھری حکومت دینے پر پوری توجہ دے گی، ملک میں پھیلی ہوئی بدعنوانیاں ختم کرنے کے لیے فکرمند ہوگی، عام انتخابات کے وقت اس کے لیڈر مسلمانوں سے ایک چانس مانگ رہے تھے اور کہتے تھے کہ ایک بار ہم کو بھی آزما کر دیکھیے، لیکن حکومت کے استحکام کے بعد اس کی توجہ ان سب سے ہٹ کر اپنے خاص مقصد کی ترویج اور اپنے سیاسی مخالفوں سے انتقام لینے کی جانب مبذول ہوگئی، صاف ستھری اور فلاحی حکومت کا تصور خواب وخیال ہوگیا، جن ریاستوں میں اسکی حکومت تھی وہاں امن وامان مفقود اور لا اینڈ آرڈر نام کی کوئی چیز ہی نہیں رہ گئی، گرانی سے لوگ



چیخ اٹھے، اب بعض ریاستوں میں انتخابات ہونے والے ہیں تو وزیر اعظم حکومت کی ناکامیوں اور بڑھتی ہوئی گرانی کی ایسی ایسی تاویلیں کررہے ہیں جن سے عام لوگ تو درکنار خود ان کا ضمیر بھی مطمئن نہ ہوگا۔

---

رہے مسلمان تو ان کا درد دکھ سننے والا کون ہے وزیر اعظم کی یہ نوازش کیا کم ہے کہ انتخابی مہم میں ان کو مسلمان بھی یاد آگئے اور انہیں یہ ہدایت دی کہ کانگریس کے بہکاوے میں نہ آئیں بی۔ جے۔ پی ان کی دشمن نہیں، اس ارشاد کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ غالباً مسلمانوں کی اکثریت کا رجحان کانگریس کی طرف ہوگیا ہے، اگر ان کے ووٹ مختلف پارٹیوں میں بٹ کر غیر موثر ہوجاتے تو شاید وزیر اعظم کو یہ فرمانے کی ضرورت نہ پیش آتی، انہوں نے دلی اور راجستھان میں بی۔ جے۔ پی حکومت کے دوران فساد نہ ہونے کی مثال بھی دی حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے، وہ اپنی پارٹی کا یہ پچھلا ریکارڈ کیوں نہیں دیکھتے جو مسلمانوں اور ان کے مذہب کے تئیں شدید جارحانہ رہا ہے، بابری مسجد ڈھانے پر کس کو فخر ہے، کیا مسلمانوں کو صرف فساد کی شکایت ہے، ان کی اصل شکایت تو یہ ہے کہ بی۔ جے۔ پی آر۔ ایس۔ ایس اور دوسری فاشسٹ ہندو تنظیموں کے ڈھرے پر چل کر ملک کا سیکولر کردار ختم کرنا چاہتی ہے، مسلمانوں کے عقائد اور موحدانہ تصورات کو مسخ کرکے مشرکانہ اوہام وخرافات میں ملوث کرنا چاہتی ہے، ان سے وندے ماترم اور سرسوتی وندنا کی مالا جپوانا چاہتی ہے، ان کا بھارتیہ کرن کرنا چاہتی ہے، ان کی زبان، ان کی تہذیب، ان کا کلچر ختم کرنا چاہتی ہے، ان کا امتیاز وشناخت مٹانا چاہتی ہے، دیومالائی نظامِ تعلیم رائج کرکے ان کے ارتداد کا سامان کرنا چاہتی ہے، مسلمانوں کی یادگاریں جو اس ملک کا قابل فخر اثاثہ ہیں مٹانا اور ان کا نام تبدیل کرنا چاہتی ہے، اسے خود مسلمانوں کا نام تک تو گوارا نہیں ہے۔

---

ابھی ۲۲ تا ۲۴ اکتوبر کو وزیر اعظم نے ریاستی وزرائے تعلیم کی جو کانفرنس بلائی تھی، اس کا مقصد تعلیم کو ہندوانا تھا، اس کی سفارشات آر۔ ایس۔ ایس کے ایک بازو بھارتیہ ودیا بھون کی تیار کردہ تھیں جس کی تین اہم دفعات تھیں، بھارتیہ کرن، راشٹریہ کرن اور ادھیاتمی کرن۔ اس میں یونیورسٹی

سطح تک ویدوں اور اپنشدوں کی تعلیم، تیسرے سے دسویں درجہ تک سنسکرت کی لازمی تعلیم اور آئین کے آرٹیکل ۲۸ تا ۳۰ کو بدلنا جن میں ملک کی مذہبی اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کی آزادی دی گئی ہے مگر خیریت یہ ہے کہ ایجنڈا جاری ہوتے ہی اس کی مخالفت شروع ہوگئی اور اپوزیشن ہی نہیں بی۔ جے۔ پی حکومت میں شریک پارٹیاں بھی کانفرنس سے احتجاجاً واک آؤٹ کر گئیں، ان کا بگڑا موڈ دیکھ کر وزیر تعلیم کو اپنی تجویز واپس لینی پڑی اور وزیر اعظم نے صفائی دی کہ "اقدار کی تعلیم دی جانی چاہیے، تعلیم میں تعصب کی گنجائش نہیں"، مگر بی۔ جے۔ پی کے دو رُخ ہیں۔ کانفرنس کے اندر تو اسے منہ کی کھانی پڑی اور کانفرنس کے باہر پھر وہی راگ الاپ رہی ہے، وزیر اعظم، وزیر تعلیم اور پارٹی صدر کے بعد کے بیانات سے بی۔ جے۔ پی کے اصل عزائم کا پتہ چلتا ہے، وہ کھلم کھلا اقلیتوں کو ہندوتوا میں رنگنے کی سازش کر رہی ہے اور وحدت و یکسانیت کے نام پر انتشار پھیلا رہی ہے ایسی صورت میں وزیر اعظم کی اس یقین دہانی کو کون تسلیم کرے گا کہ بی۔ جے پی مسلم دوست اور اقلیتوں کے تحفظ کے عہد پر قائم ہے ؎

دیں ہاتھ سے دیکر اگر آزاد ہو ملت    ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

---

گیا شہر سے ۱۶ کلومیٹر کے فاصلے پر چرکی بازار میں عرصہ دراز سے لب سڑک بچوں کا یتیم خانۂ اسلامیہ قائم ہے، ۲۵ اکتوبر کو اس کے منتظمین ڈاکٹر قمر الحسن، جناب اقبال احمد خاں اور ڈاکٹر توفیق احمد خاں وغیرہ کی دعوت پر یتیم خانہ کے یوم تاسیس کے جلسہ میں شریک ہوا، چرکی سے دو کلومیٹر کے فاصلہ پر کلونا گاؤں میں بچیوں کا یتیم خانہ اسلامیہ واقع ہے، ۲۶ اکتوبر کو اس کے تقریری پروگرام میں شرکت کی، دونوں میں دینی تعلیم کے ساتھ دسویں درجہ تک عصری تعلیم دی جاتی ہے اور تربیت پر بھی خاطر خواہ توجہ دی جاتی ہے۔ دونوں ادارے پُرفضا مقام پر واقع ہیں، ان میں تعلیم و تربیت کا اچھا نظام اور کارکنوں کا جوش و اخلاص دیکھ کر خوشی ہوئی، اللہ ان اداروں کی مزید ترقی کا سامان کرے۔ بودھ گیا کے مندر بھی دیکھے جن کے عقب میں ایک بڑی مسجد اور دینی مدرسہ بھی ہے، مدرسہ کے اساتذہ و طلبہ سے مل کر مسرت ہوئی۔



## مقالات

# جوئے مولیان ۔ تاریخی جائزہ

از پروفیسر نذیر احمد، علی گڑھ

جوئے مولیان بخارا میں ایک سرسبز و شاداب زمین کا قطعہ ہے، ہزاروں قطعے ہر ملک میں پائے جاتے ہیں، لیکن کسی قطعے سے کوئی تاریخی واقعہ منسوب ہو جانے سے اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، ایسا ہی قطعہ جوئے مولیان بھی ہے۔

نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ کے مقالۂ دوم میں سامانی امیر نصر[1] بن احمد (۳۰۱-۳۳۱ھ) کی ایک دلچسپ[2] حکایت کے ذیل میں رودکی کا ایک قطعہ نقل کیا ہے جس کی پہلی بیت میں جوئے مولیان کا ذکر ہے، اس حکایت کا خلاصہ یہ ہے: کہ امیر نصر کا دور سامانی حکومت کا دور عروج تھا، وہ سردی کا زمانہ بخارا میں گزارتا اور گرمی میں سمرقند یا خراسان کے کسی شہر میں چلا آتا، ایک سال ہرات آیا اور باغیس[3] میں مقام کیا اس لیے کہ یہ جگہ اپنی چراگاہوں کے لیے شہرت رکھتی ہے، امیر نصر یہاں کافی ٹھہرا یہاں تک کہ اس کے گھوڑے چراگاہوں میں چر کے بڑے تندرست ہوگئے، پھر

---

[1] سامانی خاندان کا تیسرا فرمانروا اسمٰعیل کا پوتا جس نے ۳۰۱ھ تا ۳۳۱ھ تک فرمانروائی کی (زین الاخبار ص ۱۵۰-۱۵۴) [2] چہار مقالہ طبع لیدن، تصحیح محمد قزوینی ۱۹۰۹ء، ص ۳۱-۳۴ [3] ہرات کے اطراف کے اس قصبے کی اہمیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اوائل تیسری صدی ہجری کے شاعر حنظلہ کا تعلق اسی جگہ سے تھا۔

امیر ہرات کی طرف چلا اور مرغ سپید نام کے قصبے میں خیمہ زن ہوا، بہار کا موسم تھا، میووں کا زمانہ تھا اور میوے کثرت سے تھے اور نہایت ارزاں، بہار کا موسم پورا گزر گیا اور امیر وہیں ٹھہرا رہا، پھر تابستان کا موسم آیا، امیر وہاں سے جانے کا نام نہیں لیتا تھا اور نام کیونکر لیتا کہ اس طرح کے کثیر میوے وغیرہ دنیا کے کسی مقام میں نہ تھے خصوصاً ویسے انگور کسی جگہ نہ اتنی فراوانی سے اور نہ اتنے عمدہ قسم کے پائے جاتے تھے، غرض امیر ایک فصل سے دوسری فصل پر ٹالتا رہا، یہاں تک کہ چار سال گزر گئے، اہل لشکر اس طویل اقامت سے تنگ آگئے، لیکن امیر سے کہنے کی جرأت کسی میں نہ تھی، سب نے مشورہ کرکے رودکی[1] شاعر کو جو امیر کی معیت میں تھا، اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ امیر کو بخارا کی طرف حرکت کرنے پر آمادہ کردے، رودکی مزاج شناس تھا، اس نے ایک عمدہ قصیدہ امیر کی خدمت میں اس وقت پیش کیا جب وہ صبوحی کرکے دربار میں آگیا تھا، رودکی نے قصیدے کو پردۂ عشاق میں مطربوں کے ساتھ گانا شروع کیا، اس کے یہ شعر چہار مقالے میں نقل ہیں:

| | |
|---|---|
| بوئے جوئے مولیان آید ہمی | بوی یار مہربان آید ہمی |
| ریگ آموی[2] و درشتی راہ او | زیر پایم پرنیان آید ہمی |
| آب جیحون از نشاں روی دوست | خنگ ما را تا میان آید ہمی |
| اے بخارا شاد باش و دیرزی[3] | میرزی تو شادمان آید ہمی |

[1] استاد ابو عبداللہ جعفر رودکی، فوت ۳۲۹ھ [2] آمو جیحوں کا دوسرا نام ہے، یہ دریا خراسان اور ماوراء النہر جس میں بخارا واقع ہے کے درمیان سرحد کا کام کرتا ہے۔ [3] پہلی "زی" زیستن سے امر حاضر اور دوسری "زی" کے معنی طرف کے ہیں۔



| | |
|---|---|
| میر ماہ است و بخارا آسمان | ماہ سوی آسمان آید ہمی |
| میر سرو است و بخارا بوستان | سرو سوی بوستان آید ہمی |

کہتے ہیں کہ رودکی نے آخری بیت پڑھی ہی تھی کہ امیر نصر اتنا متاثر ہوا کہ بغیر جوتا[1] پہنے گھوڑے پر سوار ہوگیا اور بخارا کی طرف روانہ ہوگیا۔

نظم بالا کے پہلے شعر میں کوئی قطعی قرینہ نہیں جس کی وجہ سے یہ سمجھا جائے کہ جوئے مولیان ایک جگہ کا نام ہے، نہ کسی ندی یا نہر کا، 'جو' بمعنی نہر ہے، اس لیے جوئے مولیان سے نہر مراد لینے کا بخوبی امکان ہے، چنانچہ راقم حروف بھی جوئے مولیان کو نہر ہی سمجھتا تھا، حالانکہ اس کا مضاف 'بو' اس قیاس کی رد میں پیش کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ "دریا" کا تعلق خوشبو سے نہیں ہوتا، وہ روانی، صاف شفاف پانی کے لیے مشہور ہوتا ہے، حال ہی میں ایک مجلہ "دانش" (فصلنامہ مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان شمارہ ۵۲ بہار ۱۳۷۷) میں یہ تحریر نظر سے گزری:

"صائب کہ از جوی مولیان و آب رکناباد سیراب گردیدہ بود، زندہ رود[2] تازہ، میان زمین رودہای گنگ وجمنا جاری ساخت"۔

گویا مضمون نگار کے نزدیک جوی مولیان، گنگا جمنا کی طرح کا کوئی ٹھاٹ مارتا دریا ہے، مگر یہ بات جیسا کہ میں اشارہ کر چکا ہوں صحیح نہیں، اس کا ایک قرینہ تو لفظ "بو" ہے جو بطور مضاف کے آتا ہے وہ دریا یا نہر پر صادق نہیں آتا، بلکہ سبزہ زار، گلزار، باغ وغیرہ پر صادق آتا ہے۔

[1] اصل لفظ موزہ ہے جس کے معنی یہ ہیں: نوعی از پا افزار کہ تا ساق پا و زیر زانو فرا گیرد (فرہنگ معین)، [2] اصفہان میں بہتی ہے۔

ذیل میں اس سلسلے کے مزید قرائن نقل کیے جاتے ہیں، ۱۔ چہار مقالہ کی ایک حکایت میں آیا ہے:

"پس دیگر روز امیر را بگرمابۂ جوی مولیان برُد بیرون از سرائے و آن اسب واستور را ساختہ و تنگ کشیدہ بر در گرمابہ بداشتند"[۱] (ص ۵۷)

اس عبارت میں گرمابۂ جوئے مولیان سے واضح ہے کہ جوئے مولیان ایک جگہ تھی جہاں یہ گرمابہ واقع تھا۔

ایک اور قرینہ کہ جوئے مولیان بخارا کے ایک علاقے کا نام تھا، زین الاخبار گردیزی کی اس عبارت سے[۲] ملتا ہے۔

"چون ایلک بہ اسبیجاب آمد ابو علی سوی ایلک نامہ نوشت و بدو میل کرد ایلک بہ بخارا آمد و بہ جوی مولیان[۳] فرود آمد اندر ربیع الاول سنہ اثنی وثمانین وثلثمائہ (۳۸۲ھ) و نوح ہمی نامہ نوشت و رسول فرستاد بہ ابو علی"۔

کچھ دن ہوئے راقم نرشخی کی تاریخ بخارا پڑھ رہا تھا، اس میں جوئے مولیان کے بارے میں نہایت مفید اطلاع درج ہیں، ان سے اس سلسلے کے سارے شبہات رفع ہو جاتے ہیں، تفصیلات یہ ہیں:

جب امیر سدید منصور بن نوح ماہ شوال ۳۵۰ھ میں جوئے مولیان میں تخت نشین ہوا تو حکم جاری کیا کہ [بخارا کے] محلات [جو امیر رشید کے زمانے میں جلا دیے گئے تھے] نئے سرے سے مرمت کیے جائیں، چنانچہ جو کچھ جل گیا تھا اسے پہلے سے بہتر بنا دیا گیا،

---

[۱] تصحیح قزوینی، ہالینڈ ۱۹۰۹، ص ۵۷، [۲] تصحیح حبیبی، تہران ص ۱۶۸ [۳] حاشیہ یہ ہے: جوئے مولیان از مواقع خوب بخارا بود الخ۔



پھر امیر سدید وہاں فروکش ہوا، لیکن ابھی سال پورا نہیں ہوا تھا کہ جشن سوری میں بڑے پیمانے پر آگ جلائی گئی، آگ نے محل سرا کو پکڑ لیا اور دوبارہ سارے محل نذر آتش ہو گئے، امیر رات میں جوئے مولیان آیا، خزائن و دفائن بخارا سے جوئے مولیان منتقل کر دیے گئے اور ان کی جانچ ہوئی تو پتہ چلا کہ سوائے ایک فنجان زریں کے کوئی چیز ضایع نہیں ہوئی۔

[بخارا کے علاوہ] دوسرے شاہی محل جوئے مولیان میں تھے، جوئے مولیان سے جو بہشت کے مانند ہے، بہتر کوئی اور مقام نہیں، وہاں ہر طرف محل، باغ، چمن، بوستان، بہتی نہریں تھیں جو تمام سبزہ زار کو سیراب کرتی تھیں، ان سے مزید نہریں نکالی گئی تھیں جو سبزہ زار اور گلزار میں ہر طرف بہتی تھیں، وہ اتنی دلآویز تھیں کہ جو انہیں دیکھتا حیران رہ جاتا کہ وہ کہاں سے آتی ہیں اور کہاں جاتی ہیں۔

ریگستان سے دشتک تک خوبصورت محلات، عالی عمارات، آراستہ مہمان خانے، دلکش چار باغ اور حوض اور اس پر نشستگاہیں جن پر سورج کی گرم کرنیں نہ شرق سے اور نہ غرب سے پڑتی تھیں، ان باغوں میں طرح طرح کے میوے جیسے ناشپاتی، بادام، پستہ، گیلاس، عناب اور ہر قسم کے میوے جو بہشت میں ہوتے ہیں، وہاں پائے جاتے ہیں۔ (تاریخ بخارا ص ۳۷-۳۸)

اس کے بعد ایک الگ عنوان: "ذکر جوئے مولیان وصفت او" کے تحت یہ اطلاع درج ہے:

| | |
|---|---|
| در قدیم این ضیاع جوی مولیان | جوئے مولیان کا بیان اور اس کی |
| از آن طغشادہ بودہ است دوی | خوبیاں۔ پرانے زمانے میں جوئے مولیان |

ہر کسی از فرزندان و دامادان خود
را حصہ دادہ است و امیر اسمٰعیل
سامانی رحمۃ اللہ علیہ این ضیاع
را بخرید از حسن بن محمد بن طالوت
کہ سرہنگ المستعین بن المعتصم
بود و امیر اسمٰعیل بجوی مولیان
سرائی و بوستانہا ساخت و
بیشتر بر موالیان وقف کرد و
ہنوز وقف است و پیوستہ

کی آراضی ملک[ع] طغشادہ کی ملک تھی
اور اس نے اس میں اپنے بیٹوں اور
دامادوں کو حصہ دے رکھا تھا، امیر
اسمٰعیل[۱] سامانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس
آراضی کو حسن بن[ع] محمد بن طالوت سے
جو مستعین[۲] بن معتصم[۳] کا سرہنگ تھا،
خرید لیا اور جوئے مولیان میں سرا اور
باغات تعمیر کیے اور اس کا زیادہ حصہ
غلاموں[۴] پر وقف کر دیا اور بعض وقف

عہ اس کے حالات تاریخ بخارا میں بڑی تفصیل سے ملتے ہیں، دیکھئے ۱۱-۱۴، ۲۳، ۳۹ وغیرہ لہ سامانی خاندان کا پہلا حکمران، ۲۸۰ تا ۲۹۵ھ عہ اس کے حالات کے لیے دیکھئے تاریخ بخارا تعلیقات ص، ۲۱ ۲ المستعین المعتصم کا بیٹا نہیں پوتا تھا، اس کے باپ کا نام محمد تھا، وہ خاندان بنی عباس کا ۱۲ واں خلیفہ تھا، ۲۴۸ میں تخت نشین ہوا، تین سال تک خلافت کی، اس کا باپ خلیفہ نہیں ہوا تھا، المستعین منتصر کے بعد خلیفہ ہوا، منتصر متوکل کا بیٹا اور مستعین کا چچازاد بھائی تھا ۳ معتصم (۲۱۸-۲۲۷) ہارون رشید کا بیٹا تھا اور اپنے بھائی مامون (۱۹۸-۲۱۷) کے بعد خلیفہ بنا، پتا نہیں کہ نرشخی نے تاریخ بخارا میں کیونکر اس کو مستعین کا باپ لکھا ہے جب کہ مستعین اس کا پوتا تھا ۴ اصل لفظ مولیان ہے جو موالی کی فارسی جمع ہے اور موالی مولی کی جمع ہے، اس طرح موالیان جمع الجمع ہے۔ موالی کے یہ معنی ہیں: ۱- آقایان، سروران، خداوندان ۲- بندگان ۳- یاران اور "مولی" کا فارسی املا "مولا" ہے اس کے یہ معنی ہیں: ۱- سرور، مخدوم، آقا، خداوندگار ۲- بندہ، عبد (از اضداد) (فرہنگ معین ج ۴ ص، ۴۴۲۴)



و او را از جہت موالیان خویش دل
مشغول بودی تا روزی امیر اسمٰعیل
از حصار بخارا بجوی مولیان نظارہ
می کرد سیمای الکبیر مولای پدر او
پیش او ایستادہ بود و او را بغایت
دوست داشتی و نیکو داشتی، امیر
اسمٰعیل گفت ہرگز بود کہ خدای
تعالی سببی سازد تا این ضیاع
را از بہر شما بخرم و مرا زندگانی دہد
تا بینم این ضیاع شمارہ شدہ از
آنکہ این ضیاع از ہمہ ضیاع بخارا

اب بھی باقی ہیں اور امیر اسمٰعیل اپنے
غلاموں کا بڑا خیال دل میں رکھتے تھے
ایک روز وہ حصار بخارا سے جوئے مولیان
کا نظارہ کر رہے تھے، ان کے باپ[۱] کا
غلام سیما[۲] الکبیر ان کے پاس کھڑا تھا
وہ اس کو بہت عزیز رکھتے تھے اور اسکے
ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے تھے،
امیر اسمٰعیل نے کہا کاش خدا ایسا کرتا
کہ میں یہ آراضی تمہارے لیے خرید لیتا
اور مجھے اتنی زندگی دیتا کہ میں یہ آراضی
تمہاری ملکیت میں دیکھ سکتا، اس لیے

لہ احمد کا شجرۂ نسب اس طرح ہے: احمد بن اسد بن سامان خداہ، سامان زردشتی تھا، مامون کے ہاتھ پر مسلمان ہوا، اس کا بیٹا اسد تھا، اسد کے چار بیٹے تھے: نوح، احمد، یحییٰ، الیاس، ان میں احمد سب سے زیادہ لائق تھا، اس کے دو بیٹے تھے، نصر و اسماعیل، طاہریوں کے زمانے میں سمرقند کا حاکم نصر اور بخارا کا اسماعیل تھا، ۲۷۵ میں اسماعیل اور نصر میں جنگ ہوئی، نصر ہار گیا، لیکن بھائی نے اس پر شفقت کی اور سمرقند واپس بھیج دیا اور خود بخارا کا حاکم رہا اور اس طرح اسماعیل سامانی خاندان کا پہلا حکمران ہوا (دیکھئے زین الاخبار طبع حبیبی، تہران، ص ۱۴۶-۱۴۷) ۲ اس کے حالات نہیں ملتے، دیکھئے تاریخ بخارا، تعلیقات ص، ۲۱-

بقیمت تراست وخوشتر وخوش
هواتر، خدای تعالیٰ روزی کرد
تا جملہ بخرید و بہ موالیان داد تا جوی
موالیان نام شد و عامہ جوی
مولیان گویند۔

کہ یہ آراضی بخارا کی تمام آراضیوں
میں سب سے زیادہ قیمتی، سب سے
اچھی اور بلحاظ آب وہوا سب سے
عمدہ ہے، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس نے
(امیر اسمٰعیل نے) ساری آراضی خرید
لی اور اپنے غلاموں کو دے دیا، اس
طرح یہ جوئے مولیان کے نام سے
منسوب ہوئی، جس کو عوام جوئے
مولیان کہنے لگے۔

تاریخ بخارا سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر اسماعیل اکثر جوئے مولیان میں رہتا تھا، وہیں بیمار ہوا تو رزماز لے گئے، وہیں اس کا انتقال ہوا، تاریخ[1] میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے:

امیر اسماعیل بیمار ہوا اور مدت تک بیمار رہا اور اس کی بیماری کا سبب رطوبت کی زیادتی تھی، اطبا نے کہا کہ جوئے مولیان کی ہوا مرطوب ہے اس کو رزماز منتقل کرنا چاہیے، وہاں کی آب وہوا اس کے لیے مفید ہوگی، امیر کو اس قریہ سے بڑا لگاؤ تھا، ہر وقت وہاں شکار کو جایا کرتا، وہاں اس نے باغ لگوائے تھے، عرصے تک وہاں بیمار رہا یہاں تک کہ وہیں ۱۵؍صفر ۲۹۵ھ میں وفات پائی، وہ بیس سال امیر خراسان رہا، اس کی مدت حکومت تیس سال تھی، اس کے زمانے میں بخارا دارالملک

[1] ص ۱۲۷۔



ہوا اور سارے سامانی فرمانروا اسی کو اپنا صدر مقام بنائے ہوئے تھے۔

تعلیقات تاریخ بخارا ص ۲۱۶ میں ایک وقف نامے کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدت تک امیر اسمٰعیل کی اولاد جوئے مولیان کے اوقاف سے استفادہ کرتی رہی تھی، ریچرڈ۔ ن۔ فرائی نے اپنے انگریزی ترجمے میں لکھا ہے (یادداشت ۱۲۸)

در بخشی از بخارا کہ اخلاف امیر اسمٰعیل زندگی می کردہ اند، از درآمد اوقاف تا سال ۱۹۲۰ میلادی استفادہ می شدہ است، وقف نامہ ۹۸۶ھ (۱۵۰۸ء) کہ از روی نسخۂ اصل ۲۹۵ھ (۹۰۸ء) نوشتہ شدہ فہرستی از زمینہائی ذکر می کند کہ بہ اولاد امیر اسمٰعیل متعلق بودہ است و مطابق پانچ نسخی گفتہ می باشد و در بین محلاتی کہ نام بردہ شدہ محلات نہر نوکندہ وجوی مولیان دیدہ می شود، و در کتاب بخارا نیز گوید:

این نکتہ شایان توجہ است کہ بعضی از املاک بخارا حتی تقریباً تا عصر حاضر در دست اعقاب سامانیان باقی ماندہ است۔

جوئے مولیان کی گفتگو کے بعد اب ہم رودکی کے منظومہ کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں:

اور اس نظم کے بدلے جس سے امیر نصر اتنا متاثر ہوا کہ بغیر موزہ پہنے بخارا روانہ ہوگیا، رودکی نے اہل لشکر سے پانچ ہزار دینار کا دونا وصول کیا، نظامی عروضی کہتا ہے کہ میں نے ۵۰۴ھ میں سمرقند میں دہقان ابو رجا احمد بن عبدالصمد العابدی سے یہ کہتے سنا ہے کہ اس کے جد ابورجا نے یہ بیان کیا ہے کہ اس موقع پر جب رودکی سمرقند پہنچا تو اس کے پاس چار سو اونٹ تھے اور حق یہ ہے کہ وہ اپنی شان وشوکت کا بخوبی استحقاق رکھتا تھا، اس لیے کہ اس قصیدے کا اب تک

کوئی جواب نہیں لکھ سکا ہے، اس قصیدہ کا جواب لکھنا گویا اپنے کو مشکل میں ڈالنا ہے جہاں سے آسانی سے نکلنا ممکن نہیں ہو سکتا، امیر الشعرا معزی ایران کے لطیف طبع شاعروں میں بڑا امتیاز رکھتا تھا اور اس کے اشعار نہایت رواں اور لطیف ہوتے تھے، زین الملک[1] ابو سعد ہندو بن محمد بن ہندو اصفہانی نے اس سے اس قصیدے کے جواب کی فرمائش کی، معزی نے انکار کیا، مالک نے زین الملک کے اصرار پر چند اشعار کہے جن میں ایک شعر یہ ہے :

رستم از مازندران آید ہمی — زین ملک از اصفہان آید ہمی

سخن شناس اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس شعر کی رودکی کے شعر سے کوئی نسبت نہیں اور اس خوبی کے ساتھ اس طرح کا شعر کون کہہ سکتا ہے۔

آفرین[2] و مدح سود آید ہمی — گر بگنج اندر زیان آید ہمی

اور اس بیت میں سات شعری محاسن ہیں۔

اول مطابق، دوم متضاد، سوم مردف، چہارم بیان مساوات، پنجم عذوبت، ششم فصاحت، ہفتم جزالت اور جو علم شعر کا استاد ہے وہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ میں نے جو کہا ہے وہ[3] درست ہے (چہار مقالہ طبع یورپ ص ۳۳-۳۴)

[1] سلطان محمد بن ملک شاہ سلجوقی (۴۹۸-۵۱۱ھ) کے دیوان کا مستوفی تھا، دشمنوں نے اس کی شکایت سلطان محمد سے اتنی کی کہ اس نے ۵۰۶ھ میں اسے پھانسی دلا دی۔ (چہار مقالہ ص ۱۶۰-۱۶۱) زین الملک علم سے بے بہرہ تھا، فعل ماضی پر الف لام کے اضافے کی مثال تاریخ میں درج ہے (ایضاً)، قابل توجہ ہے کہ اس کا اور اس کے دادا دونوں کا نام ہندو تھا [2] اس منظومہ کے چھ شعر ایک جگہ ہیں، اس کو ملا کر کل سات شعر ہوئے [3] مرزا محمد قزوینی نے اس پر ایک دلچسپ

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۵ پر)



رودکی کے اس قصیدے کی مقبولیت کا اندازہ مندرجہ بالا بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے، ہندوستان میں بھی یہ چھوٹا سا قصیدہ مقبول تھا، چنانچہ بعض شاعروں نے بھی اس کے جواب میں چند شعر لکھے ہیں۔

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ رودکی کے اس مقبول قصیدے میں جوئے مولیان کا ذکر ہے جس کو غلطی سے نہر سمجھا گیا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ بخارا کے نواح میں ایک نہایت سرسبز و شاداب علاقہ تھا جو ہر شخص کے لیے جالب توجہ تھا، رودکی نے اسی علاقے کی یاد امیر نصر کے اہل لشکر کو دلائی تھی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۴) بحث کی ہے جو قابل ملاحظہ ہے، دیکھئے چہار مقالہ ص ۱۶۱۔

# علامہ شبلی نعمانی کا نظریۂ تاریخ

از جناب محمد الیاس الاعظمی

علامہ شبلی مشرق و مغرب دونوں کے تاریخی نظریات سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جہاں اسلامی اور ایرانی مورخین کے تاریخی اصول و آئین اور افکار و خیالات پر وسیع نظر رکھتے تھے جن سے انہوں نے مکمل استفادہ کیا تھا وہاں انہوں نے مغربی مورخین کے عمدہ اصولوں سے بھی اخذ و استفادہ کیا تھا، جس طرح انہوں نے اسلامی مورخوں کے نقائص بیان کیے ہیں، اسی طرح یورپ کے مورخین کی بے اعتدالیوں سے بھی آگاہ کیا ہے اس فن میں انکی کاملیت و جامعیت اور بصیرت و ژرف نگاہی کی وجہ سے عموماً اعتراف کیا جاتا ہے کہ علامہ شبلی دراصل خود اپنا ایک نظریۂ تاریخ رکھتے تھے اور اس بارے میں وہ کسی کے پیرو یا مقلد نہ تھے، ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:۔

"شبلی درحقیقت ایک مسلم مورخ تھے، اسلامی تاریخ کی تائید و حمایت میں جو خیال انہیں پسند آتا تھا اس کو حسب مطلب استعمال کر لیتے تھے، جہاں تک راقم کا خیال ہے وہ کسی خاص مغربی نظریہ اور مسلک کے پابند نہ تھے"[۱]

وہ دور جدید کے پہلے مورخ ہیں جنھوں نے مشرق و مغرب کے تصورات تاریخ پر حسن و قبح کی نظر ڈالی اور ان نظریات کی آمیزش اور اپنی مجتہدانہ صلاحیتوں سے ایک

۱؎ شبلی کا نظریۂ تاریخ، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اپریل ۳۸ء ص ۲۸۲۔



نئے فلسفۂ تاریخ کی بنیاد ڈالی، ڈاکٹر سید عبداللہ نے درست لکھا ہے کہ:

"وہ صرف مورخ ہی نہ تھے بلکہ ایک خاص فلسفۂ تاریخ کے واضع و نقاد بھی تھے"

انہوں نے مغرب اور مشرق کے تاریخی سرمایہ پر جو تنقید کی ہے وہ بلا شائبۂ مبالغہ اصول تاریخ کے لیے ایک دستور اساسی کا حکم رکھتی ہے"[۲]

علامہ شبلی کے فلسفۂ تاریخ کے متعلق دور جدید کے دیدہ ور مورخ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

"فن تاریخ نویسی میں مولانا شبلی کا سب سے عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے عربی ایرانی اور مغربی نظریہ ہائے تاریخ کو ایک فکری وحدت میں ڈھال کر اس طرح پیش کیا کہ اس میں عربوں کی حقیقت نگاری، ایرانیوں کا ذوق ادب اور مغرب کا انداز تحقیق جمع ہو گیا"[۳]

ہم یہاں علامہ شبلی کی ان خصوصیات پر ایک نظر ڈالتے ہیں انہوں نے تاریخ کی تعریف ایک بڑے مصنف اور ایک حکیم کے حوالہ سے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"فطرت کے واقعات نے انسان کے حالات میں جو تغیرات پیدا کیے ہیں اور انسان نے عالم فطرت پر جو اثر ڈالا ہے ان دونوں کے مجموعہ کا نام تاریخ ہے ۔۔۔ ان حالات کا پتہ چلانا جن سے دریافت ہو کہ موجودہ زمانہ گزشتہ زمانہ سے کیونکر بطور نتیجہ پیدا ہوا"[۴]

دوسری جگہ مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۲؎ سر سید اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۷۲ ۳؎ معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۸۶ء ص ۱۸۸
۴؎ الفاروق ص ۹۔

"چونکہ یہ مسلم ہے کہ آج دنیا میں جو تمدن، معاشرت، خیالات، مذاہب موجود ہیں سب گزشتہ واقعات کے نتائج ہیں جو خواہ مخواہ ان سے پیدا ہونے چاہیے تھے اس لیے ان گزشتہ واقعات کا پتہ لگانا اور ان کو اس طرح ترتیب دینا جس سے ظاہر ہو کہ ہر موجودہ واقعہ گزشتہ واقعات سے کیونکر پیدا ہوا اسی کا نام تاریخ ہے"[1]

تاریخ کی اس تعریف کے بارے میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ یہ تعریف بڑی جامع ہے، عالم فطرت میں واقع ہونے والے واقعات اور تبدیلیوں کا اثر انسانوں کی ساخت مزاج اور فکر و عمل پر پڑتا ہے پھر ان کے فکر و عمل کی جولانیوں کی وجہ سے عالم فطرت کے بہت سے اسرار کھلتے رہے ہیں اور کھلتے رہیں گے، آدمی کی کہانی اسی عمل اور رد عمل کی داستان ہے، پھر دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ کسی آنے والے واقعہ کا سبب بن جاتا ہے علت و معلول کا یہ سلسلہ ابتدائے آفرینش سے جاری ہے اور جاری رہے گا، آدمی کی کہانی اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے"[2]

علامہ شبلی کا فلسفہ تاریخ جن اصولوں پر مشتمل ہے ان کی تشریح خود انہوں نے اپنی تحریروں میں جا بجا کی ہے، مثلاً تاریخ کیا ہے، تاریخ کا مقصد کیا ہے، مورخ کے فرائض کیا ہیں، اسے کن کن باتوں کا علم ہونا چاہیے اسے کن باتوں پر عمل اور کن سے احتراز کرنا چاہیے مورخ کا انداز تحریر کیسا ہو، یہاں علامہ شبلی کے انہیں اصولوں کا تجزیہ کیا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ انہوں نے اسلامی تاریخ اور مغربی تاریخ دونوں کی کن خوبیوں کو کس حد تک استعمال کیا، خامیوں کو کن بنیادوں پر نظر انداز کیا، گویا مجموعی طور پر

[1] الفاروق ص ۹ [2] اشخاص و افکار ص ۷۰۔



ان کے فلسفہ تاریخ کا تصور کیا ہے۔

**پہلا اصول** مورخ جس عہد کی تاریخ لکھے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس عہد کے تمام حالات و واقعات لکھے مثلاً تہذیب و تمدن، معاشرت، اخلاق و عادات، مذہب گویا ہر چیز سے متعلق معلومات بہم پہونچائے، صرف سیاسی امور، فتح و شکست، معرکوں اور خانہ جنگیوں کا تذکرہ نہ ہو اور سیاست اور تاریخ معاشرت کی داستان طرازی کا فرق اور موخر الذکر کی اہمیت علامہ شبلی کی اس بلیغ تحریر سے ظاہر ہے کہ:

"کسی غیر قوم کا کسی غیر ملک پر قبضہ کرنا کوئی جرم نہیں ورنہ دنیا کے سب سے بڑے فاتح سب سے بڑے مجرم ہوں گے، دیکھنا یہ چاہیے کہ فاتح قوم نے ملک کی تہذیب و تمدن پر کیا اثر ڈالا"[1]

شروع میں مشرق و مغرب کے بیشتر مورخین محض جنگ و جدل اور امور سیاست کے واقعات بیان کرتے رہے، لیکن اس طرز تاریخ نویسی سے بقول علامہ شبلی انسانی تہذیب و معاشرت کے بہت سے روایات اور شاندار آثار مٹ گئے، خود مسلمانوں کی تاریخ کے بہت سے عجیب و غریب کارنامے گمنامی کی خاک میں دفن ہو گئے[2]، علامہ شبلی خاص طور پر ایشائی مورخین کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ایشائی مورخین کی عادت ہے کہ وہ تاریخی واقعات میں صرف جنگ و جدل، بغاوت اور خونریزی کے واقعات کو لیتے ہیں اور انکو خوب پھیلاتے ہیں اسلیے یورپ والے ہماری تاریخوں کو قصائی کی دوکان کہتے ہیں اور واقعی ان تاریخوں سے اس عہد کے تمدن، شائستگی، پالٹکس، معاشرت، خانگی زندگی کا پتہ لگانا ہو تو بہت کم کامیابی ملے گی"[3]

[1] مقالات شبلی ج ۶ ص ۱۴۳ [2] ایضاً ص ۱۷۶ [3] ایضاً ج ۴ ص ۵۹۔

ایرانی تاریخ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ایران کی تاریخ میں دور از کار واقعات کثرت سے ہیں اور فردوسی کی شاعرانہ رنگ آمیزی نے تو تاریخ کو ناول بنا دیا۔"[۱]

اٹھارہویں صدی عیسوی سے پہلے جو یورپ کے عہد ظلمت سے نکلنے کا عہد ہے، خود یورپ کا بھی یہی حال تھا، ان کے نزدیک بھی کسی سلطنت کی عظمت و سطوت اور پستی و تنزل کا معیار فتوحات ملکی تھیں۔[۲]

اسلامی مورخوں نے یہی مروجہ اور عام طرز سیرت نگاری میں بھی اختیار کیا چنانچہ ابتداءً جو کتابیں سیرت پر قلم بند کی گئیں ان کا نام اسی طرز نگارش کی وجہ سے مغازی رکھا گیا اور ان میں صرف عہد رسالت کے معرکوں کا ذکر کیا گیا، حالانکہ یہ طرز نگارش نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نگاروں کے لیے کسی طرح موزوں نہ تھا کیونکہ علامہ شبلی کے الفاظ میں "یہ سکندر کے سوانح نہیں بلکہ فرشتہ یزدانی کی سیرت تھی"[۳] اور طرفہ تماشہ یہ کہ اس طرز تاریخ نگاری کا یہ حال ہے کہ بقول علامہ شبلی "تاریخوں میں حالات جنگ کے ہزاروں صفحے پڑھ کر بھی فن جنگ کے اصول پر کوئی معتدبہ اطلاع نہیں ملتی۔"[۴]

**دوسرا اصول** مورخ کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کرے کیونکہ اس کے بغیر واقعات اپنی اصلی صورت میں سامنے نہ آسکیں گے اور چونکہ "تاریخ عالم کا ہر واقعہ بہت سے مختلف واقعات کے سلسلے میں بندھا ہوا ہے،[۵] مثلاً یہ کہ چند صحرا نشینوں نے کیونکر فارس و روم کا دفتر الٹ دیا اور یہ کہ عباسیہ اور

[۱] مقالات شبلی ج ۴ ص ۲۵ [۲] ماہنامہ معارف اعظم گڑھ ج ۱۴ ش ۳ ص ۲۰۰ [۳] سیرۃ النبی ج ۱ دیباچہ ص ۵۴ [۴] الفاروق حصہ اول ص ۱۱ [۵] المامون ص ۱۱۔



سادات کے ہوتے ہوئے بنو امیہ کیونکر خلافت پر قابض ہو گئے، اس لیے ان اسباب کا پتہ لگانا نہایت ضروری ہے اور ایک مورخ بغیر ان امور کا سراغ لگائے کسی صحیح نتیجہ پر پہونچ نہیں سکتا، علامہ شبلی کے الفاظ ہیں:

"انہیں ریشہ دوانیوں کا پتہ لگانا اور ان سے فلسفیانہ نکتہ سنجی کے ساتھ تاریخی نتائج مستنبط کرنا یہی چیز ہے جو علم تاریخ کی جان اور روح ہے۔"[۶]

باوجود اس اہمیت کے علامہ شبلی کو شکایت ہے کہ ایک جانب اسلامی مورخوں نے اس اصول کی طرف نظر بھی اٹھا کر نہ دیکھا تو دوسری جانب یورپ نے اس سے غلو کی حد تک اعتناء کیا اس لیے وہ راہ اعتدال سے بھٹک گیا، چنانچہ انہوں نے اسباب و علل کی تلاش اور ان سے نتائج مستنبط کرنے میں یورپ کی بے اعتدالیوں سے احتراز کیا ہے۔

**تیسرا اصول** واقعات میں اسباب و علل کے سلسلے پیدا کرنے کے لیے اکثر جگہ قیاس و اجتہاد سے مورخ کو کام لینا پڑتا ہے اور چونکہ وہ اس سے صرف نظر نہیں کر سکتا اس لیے اس کا یہ لازمی فرض ہے کہ وہ قیاس و اجتہاد کو اصل واقعہ میں اس قدر مخلوط نہ کر دے کہ کوئی شخص اگر دونوں کو الگ کرنا چاہے تو نہ کر سکے۔[۷]

قیاس و اجتہاد سے جو رائے قائم کی جاتی ہے اسلامی مورخین نے اسے اصل واقعہ میں مختلط ہونے سے بچانے کے لیے اس قدر احتیاط کی کہ گرد و پیش کے ظاہری اسباب و علل پر بھی نظر نہ ڈالی اور واقعات کو خشک اور ادھورا ہی چھوڑ دیا، مثلاً انہوں نے اکثر غزوات کا تذکرہ اس طرح شروع کیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں قبیلہ پر فلاں وقت فوجیں بھیج دیں مگر فوجیں بھیجنے کے اسباب پر مطلق روشنی نہیں ڈالی، اسلامی

[۶] المامون ص ۱۱ [۷] الفاروق ص ۱۸-۱۹۔

مورخوں کی اس غیر ضروری احتیاط سے بقول علامہ شبلیؒ عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور ان کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر ہیں اسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، حالانکہ زیادہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے کہ جن قبائل پر فوجیں بھیجی گئیں وہ پہلے سے آمادہ جنگ اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے[1]

اسباب و علل کی طرف اسلامی مورخین کے توجہ نہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ انہوں نے تاریخ میں واقعیت اور صداقت کے پہلو پر اپنی ساری توجہ مبذول کر دی' علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"اسلامی مورخ نہایت سچائی اور انصاف اور خالص بے طرفداری سے واقعات کو ڈھونڈھتا ہے اس کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ واقعات کا اثر اس کے مذہب پر معتقدات پر اور تاریخ پر کیا پڑے گا، اس کا قبلہ مقصد صرف واقعیت ہوتی ہے وہ اس پر اپنے معتقدات اور قومیت کو بھی قربان کر دیتا ہے"[2]

اس کے برعکس مغربی مورخین نے اسباب و علل کی تلاش پر بہت زور دیا، مگر اس میں انہوں نے اپنی خود غرضی اور خاص مطمح نظر کی وجہ سے بڑی بے اعتدالیاں کیں علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ:

"وہ نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلہ معلولات پیدا کرتا ہے اس میں بہت کچھ اس کی خود غرضی اور خاص مطمح نظر کو دخل ہے وہ اپنے مقصد کو محور بنا لیتا ہے تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں"[3]

---

[1] سیرۃ النبی ج ا دیباچہ ص ۳۹ [2] ایضاً ص ۳۸-۳۹ [3] ایضاً۔



علامہ شبلی نے یورپ کی اسی بے اعتدالی کو طرز استدال کی ملمع سازی اور یورپ کا خاص انداز قرار دیا ہے[1]

غرض اسباب و علل کی تلاش میں قیاس و اجتہاد سے نتائج مستنبط کرنے کے سلسلہ میں علامہ شبلی نے ایک معتدل اصول پیش کیا ہے جیسا کہ اوپر کے تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

**چوتھا اصول** مورخ جو واقعہ قلم بند کرے اس کی صحت و صداقت مسلم ہونی چاہیے، صحت واقعہ کی تعیین کے لیے مغربی مورخین کے یہاں کوئی اصول و ضابطہ نہیں ہے' البتہ اسلامی مورخین نے اس پر بہت زور دیا اور اس کے لیے دو اصول روایت و درایت ایجاد کیے، علامہ شبلی نے ان دونوں اصولوں کو صحت واقعہ کے لیے نہایت ضروری قرار دیا ہے۔

**پانچواں اصول : روایت** جو واقعہ قلم بند کیا جائے اس شخص سے کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا اور اگر وہ خود شریک واقعہ نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کی جائے کہ جو اشخاص سلسلہ روایت میں آئے کون لوگ تھے' کیا مشاغل تھے' چال چلن کیسا تھا، سمجھ کیسی تھی' ثقہ تھے یا غیر ثقہ، سطحی الذہن تھے یا دقیقہ بیں، عالم تھے یا جاہل۔[2]

علامہ شبلی نے روایت کو اسلامی فن تاریخ کا پہلا اصول قرار دیا ہے' لکھتے ہیں:

"اس امر پر مسلمان بے شبہ فخر کر سکتے ہیں کہ روایت کے فن کے ساتھ انہوں نے جس قدر اعتنا کیا کسی قوم نے کبھی نہیں کیا، انہوں نے ہر قسم کی روایتوں میں مسلسل سند کی جستجو کی اور راویوں کے حالات اس تفحص اور تلاش سے بہم پہنچائے

---

[1] الفاروق حصہ دوم ص ۴ [2] سیرۃ النبی ج ا دیباچہ ص ۲۴-۲۵

کہ اس کو ایک مستقل فن بنا دیا جو فن رجال کے نام سے مشہور ہے[۱]

یہ اصول اصلاً مسلمانوں نے فن حدیث کے لیے وضع کیا تھا مگر فن تاریخ میں بھی مسلمانوں نے اس سے کام لیا[۲]۔ قدیم مورخین اسلام نے اپنی تصنیفات میں اس کا سختی سے التزام کیا البتہ متاخرین نے اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دی جبکہ یورپ کے مورخین اس فن کے نام سے بھی واقف نہیں علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"یورپ نے فن تاریخ کو آج کمال کے درجے پر پہونچا دیا ہے لیکن اس خاص امر (روایت) میں وہ مسلمان مورخوں سے بہت پیچھے ہیں ان کو واقعہ نگار کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی یہانتک کہ وہ جرح وتعدیل کے نام سے بھی آشنا نہیں"[۳]

چنانچہ یورپ میں جب کوئی واقعہ مدت کے بعد قلم بند کیا جاتا ہے تو چونکہ مورخین یورپ جرح وتعدیل اور روایت کے اصولوں سے واقف نہیں اس لیے بقول علامہ شبلی

"ہر قسم کی بازاری افواہیں قلم بند کرلی جاتی ہیں جن کے راویوں کا نام ونشان تک معلوم نہیں ہوتا ان افواہوں میں سے وہ واقعات انتخاب کرلیے جاتے ہیں جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں"[۴]

**چھٹا اصول: درایت** | مورخ جو واقعہ لکھے وہ عقلی شہادت کے مطابق ہو یا واقعہ پر اصول درایت سے تنقید کرکے واقعہ کی صحت کا تعین کرے مثلاً:

۱۔ واقعہ اصول عادت کی رو سے ممکن ہے یا نہیں؟

[۱] الفاروق حصہ اول ص ۱۲ [۲] ایضاً [۳] ایضاً [۴] سیرۃ النبی ج ۱ دیباچہ ص ۴۴۔



۲۔ واقعہ کے متعلق اس زمانہ میں لوگوں کا میلان عام مخالف تھا یا موافق؟

۳۔ واقعہ اگر کسی حد تک غیر معمولی ہے تو اسی نسبت سے ثبوت کی شہادت زیادہ قوی ہے یا نہیں؟

۴۔ اس امر کی تفتیش کی جائے کہ راوی جس چیز کو واقعہ ظاہر کرتا ہے اس میں اسکے قیاس اور رائے کا کس قدر حصہ شامل ہے۔

۵۔ راوی نے واقعہ کو جس صورت میں ظاہر کیا ہے وہ واقعہ کی پوری تصویر ہے یا اس امر کا احتمال ہے کہ راوی اس کے ہر پہلو پر نظر نہیں ڈال سکا اور واقعہ کی تمام خصوصیتیں نظر میں نہ آسکیں۔

۶۔ اس بات کا اندازہ لگایا جائے کہ زمانے کے امتداد اور مختلف راویوں کے طریقہ ادا نے روایت میں کیا کیا اور کس کس قسم کے تغیرات پیدا کردیے ہیں[۱]

علامہ شبلی کا خیال ہے کہ "ان اصولوں کی صحت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا اور ان کے ذریعہ بہت سے مخفی راز معلوم ہوسکتے ہیں"[۲]

روایت ودرایت دونوں اصولوں کی ابتدا قرآن مجید سے ہوئی[۳]۔ روایت کے ساتھ مسلمان مورخوں نے اس قدر اعتنا کیا کہ اسے ایک قابل فخر فن بنا دیا مگر درایت کو جس قدر ترقی دینی چاہیے تھی وہ اس سے محروم رہا اور فن تاریخ میں تو اس کا نام بھی نہیں لیا گیا، ابن مسکویہ پہلا مورخ ہے جس نے تجارب الامم میں پہلی بار اس موضوع پر روشنی ڈالی اس کے بعد ابن خلدون نے درایت کی طرف خاص توجہ دی اور اسکے اصول نہایت باریک بینی اور نکتہ سنجی کے ساتھ مرتب کیے ان کا خیال ہے کہ "واقعہ کی

[۱] الفاروق ص ۱۴-۱۵ [۲] ایضاً [۳] سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۶-۲۷۔

تحقیق میں پہلے جرح و تعدیل سے بحث نہیں کرنی چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ واقعہ فی نفسہ ممکن بھی ہے یا نہیں کیونکہ اگر واقعہ کا ہونا ممکن ہی نہیں تو راوی کا عادل یا ثقہ ہونا بیکار ہے، امکان سے مراد امکان عقلی نہیں بلکہ اصول عادت اور قواعد تمدن ہیں[1]۔

علامہ شبلی نے درایت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ابن مسکویہ اور ابن خلدون سے ماخوذ ہے۔

درایت کے سلسلہ میں یورپ کے جدید مورخین نے بھی کافی توجہ دی ہے مگر قدیم مورخین بہر حال اس سے ناآشنا تھے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"یہ اس وقت سے رائج ہے جب یورپ کے عیسائی مورخ اپنے بزرگوں کی کرامتوں اور خوارق کے ذکر ہی کو تاریخ نویسی کا کمال سمجھتے تھے ان کے نزدیک ازمنہ ماضی کی تاریخ بلکہ کل تاریخ کا سارا سرمایہ یونان سے متعلق تھا جن کا خیال تھا کہ مذہبی معاملات میں عقل سے کام لینا جرم ہے"[2]

**ساتواں اصول** واقعات کو مختلف علوم و فنون سے تعلق ہوتا ہے اسلیے مورخ کا ایک ضروری فریضہ یہ بھی ہے کہ واقعہ کا تعلق جن فنون سے ہے وہ اس کا ماہر ہو مثلاً اگر جنگ کے واقعات لکھے تو فن حرب سے واقف ہو انتظامی امور قلم بند کرے تو قانون سے واقف ہو اخلاقی تذکرے تحریر کرے تو علم الاخلاق سے آشنا ہو سیاست پر خامہ فرسائی کرے تو اصول سیاست کا ماہر ہو کیونکہ بقول علامہ شبلی:

"مورخ اگر ان تمام امور کا ماہر ہو تو واقعات کو علمی حیثیت سے دیکھ سکتا ہے ورنہ اس کی نظر اسی قسم کی سطحی ہوگی جیسی کہ ایک عامی کی ہوسکتی ہے اس کی مثال

[1] الفاروق ص ۱۲ [2] معارف اعظم گڑھ ج ۱۴۱ ش ۳ ص ۲۰۲۔۲۰۳۔



یہ ہے کہ اگر کسی عمدہ عمارت پر ایک ایسے واقعہ نگار انشاپرداز کا گزر ہو جو انجینیری کے فن سے ناواقف ہے تو گو وہ اس عمارت کا بیان ایسے دلکش پیرایہ میں کرے گا جس سے عمارت کی رفعت اور وسعت اور ظاہری حسن و خوبی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے گی لیکن اگر اس کے بیان میں خاص انجینیری کے علمی اصول اور اس کی باریکیاں ڈھونڈھی جائیں تو نہ مل سکیں گی"[1]

اس اصول سے علامہ شبلی کے ذہن رسا کا اندازہ ہوتا ہے، یہ دراصل ان کے فلسفہ تاریخ کا بنیادی جزء ہے گو یہ اصول تاریخ نویسی کے لیے نہایت سخت اور مشکل ہے تاہم اگر مورخ ان خوبیوں سے آراستہ ہو تو وہ واقعی تاریخ نگاری سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں علامہ شبلی کے اس خیال کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ "اگر خوش قسمتی سے تاریخ کا فن ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا ہوتا جو تاریخ کے ساتھ فن جنگ، اصول قانون، اصول سیاست اور علم الاخلاق سے بھی آشنا ہوتے تو آج یہ فن کہاں سے کہاں پہونچا ہوتا۔ بدقسمتی سے ہمارے مورخین اس معیار کے حامل نہیں تھے اسی وجہ سے بقول علامہ شبلی تاریخ کا فن نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ تمام قوموں میں ناتمام رہا"[2]

**آٹھواں اصول** علامہ شبلی نے رینکی (RENKE) کے بارے میں ایک پروفیسر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

"اس نے تاریخ میں شاعری سے کام نہیں لیا وہ نہ ملک کا ہمدرد بنا نہ مذہب

[1] الفاروق حصہ اول ص ۱۱ [2] ایضاً ص ۱۰۔۱۱۔

اور قوم کا طرفدار ہو اکسی واقعہ کے بیان کرنے میں مطلق پتہ نہیں چلتا کہ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے اور اس کا ذاتی اعتقاد کیا ہے[1]

اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی بھی ایک مورخ کے لیے یہ ضروری خیال کرتے تھے کہ وہ تاریخ نگاری میں شاعری اور انشاپردازی سے کام نہ لے نہ ملک و قوم کی ہمدردی وطرفداری اور اس کی خوشی و ناخوشی اور اعتقاد ذاتی اس کی تاریخ نگاری پر اثرانداز ہو، صاف لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ غیر جانبداری کو ضروری خیال کرتے تھے۔

**نواں اصول** ماضی کے واقعات کو ماضی کے معیار و مذاق سے دیکھنا اور پرکھنا چاہیے اور موجودہ طرز سلطنت کو پچھلی ایشیائی حکومتوں کے اندازہ کرنے کے پیمانہ نہیں بنانا چاہیے[2]

**دسواں اصول** علامہ شبلی کے نزدیک مورخ کا منصب واقعہ نگاری ہے فیصلہ نویسی نہیں کیونکہ تاریخ کا انداز مقدمہ دیوانی یا فوجداری کے فیصلے سے بالکل مختلف ہے[3] اس لیے مورخ کو اپنے منصب پر باقی رہتے ہوئے فیصلہ نویسی سے احتراز کرنا چاہیے۔

**گیارہواں اصول** علامہ شبلی نے مورخ کا لازمی فرض یہ بھی بتایا ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہ کرے، انشاپردازانہ تاریخ کو اگرچہ قبول عام حاصل ہوتا ہے لیکن درحقیقت تاریخ اور انشاپردازی کی حدیں جدا جدا ہیں ان دونوں میں وہی فرق ہے جو نقشہ اور تصویر میں ہے علامہ شبلی لکھتے ہیں:

" ان دونوں میں جو فرق ہے وہ نقشہ اور تصویر کے مشابہ ہے نقشہ کھینچنے والے کا

۱؎ الفاروق حصہ اول ص ۱۱ ۲؎ المامون ص ۲۰۳-۲۰۴ ۳؎ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۳۳۵۔



یہ کام ہوتا ہے کہ کسی حصہ زمین کا نقشہ کھینچے تو نہایت دیدہ ریزی کے ساتھ اس کی ہیئت، شکل، جہت، اطراف، اضلاع ایک ایک چیز کا احاطہ کرے بخلاف اس کے مصور صرف اُن خصوصیات کو لے گا یا ان کو زیادہ نمایاں صورت میں دکھلائے گا، جن میں کوئی خاص اعجوبگی ہو اور جن سے انسان کی قوت منفعلہ پر اثر پڑتا ہے مثلاً رستم و سہراب کی داستان کو ایک مورخ لکھے گا تو سادہ طور پر واقعہ کے تمام جزئیات بیان کردیگا لیکن ایک انشاپرداز ان جزئیات کو اس طرح ادا کرے گا کہ سہراب کی مظلومی و بیکسی اور رستم کی ندامت وحسرت کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے گی اور واقعہ کے دیگر جزئیات باوجود سامنے ہونے کے نظر نہ آئیں گے"[1]

علامہ شبلی کے اس اصول تاریخ کا ذکر کبھی عموماً مورخین کے یہاں اصول کی حیثیت سے نہیں ملتا اسلامی مورخین نے ضرور یک گونہ توجہ دی ہے اور مغربی مورخین مثلاً شرمین کینٹ اور رینکی وغیرہ کے یہاں بھی اس اصول کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے، لیکن حقیقتاً اصول کی حیثیت علامہ شبلی نے دی اور اسے مورخ کا لازمی فرض قرار دیا:

**بارہواں اصول** علامہ شبلی نے افراد کی تاریخ نگاری میں انسانی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریوں کی نشاندہی کو بھی ضروری قرار دیا ہے[2]

**تیرہواں اصول** علامہ شبلی کے نزدیک سیرت وسوانح اگرچہ تاریخ کا حصہ ہے تاہم اسے علوم وفنون کی صف میں ایک خاص درجہ حاصل ہے ان کا خیال ہے کہ سیرت کے صحیح اور یقینی واقعات حدیث کی کتابوں میں ہیں اس لیے انہوں نے یہ اصول پیش کیا کہ" سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں پھر احادیث صحیحہ میں پھر

۱؎ الفاروق حصہ اول ص ۱۸ ۲؎ مقالات شبلی ج ۴ ص ۸۱۔

عام احادیث میں کرنی چاہیے اگر نہ ملے تو روایات سیرت کی طرف توجہ کی جائے۔ کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں اور ان کے روایات و اسناد کی تنقید لازم ہے۔[۸۱]

**چودہواں اصول** علامہ شبلی نے مورخ کا ایک یہ فرض بھی بتایا ہے کہ وہ اپنی تاریخ میں جن کتب و مضامین سے استفادہ کرے یا ان میں ظاہر کی گئی آرا و خیالات نقل کرے تو صداقت کو قائم رکھنے کے لیے ان کا حوالہ دے ان کے نزدیک "تاریخ اور روایت میں حوالہ اور استناد سب سے مقدم چیز ہے۔"[۸۲]

حوالہ انہیں کتابوں کا دینا چاہیے جنھیں خود مصنف نے دیکھا اور پڑھا ہو ان کتابوں کا حوالہ نہ دے جسے خود مصنف نے نہ دیکھا ہو کیونکہ نقل در نقل ہو کر اکثر واقعات اپنی اصلی صورت پر باقی نہیں رہتے[۸۳] مطبوعہ کتابوں کے مطبع کا بھی اندراج ہو اگر کتاب قلمی ہے تو اس کی تمام تفصیلات دی جائیں۔

علامہ شبلی کا یہ اصول مغرب سے اخذ کردہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ "اس زمانہ میں انگلستان کے مورخین کا ایک گروہ آکسفورڈ گروپ کے نام سے مشہور تھا جس نے سند اور حوالہ کو تاریخی دیانت کے لیے مورخ کا لازمی فرض قرار دیا تھا" بہرحال علامہ شبلی کو اردو زبان میں سند اور حوالہ کے التزام میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔

اوپر کی بحث سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تاریخ میں علامہ شبلی کا سب سے عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ نگاری کے بلند اور معیاری اصول وضع کیے اور نہ صرف علامہ ابن خلدون کی طرح اس کے اصول و آئین منضبط کیے بلکہ انہیں عملی طور پر بھی پیش کرنے کی کوشش کی، مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم، المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر اور سیرۃ النبی جیسی بلند پایہ اور اہم بالشان کتابیں اور متعدد معرکۃ الآرا تاریخی مقالات ہمارے اس دعویٰ کے شاہد عدل ہیں۔

# ابونواس

از جناب بہار الحق رضوی صاحب۔ رامپور۔

(۲)

**عربی شاعری** دور عباسی تک عربی شاعری کے چار دور تھے۔ جاہلی، مخضرمی، اسلامی اور محدثون (جدید) دور جاہلیت کی شاعری اپنے کمال کو پہونچ چکی تھی، وہ عرب کی قبائلی زندگی کی عکاس تھی اور زندگی سے اس کا قریبی تعلق تھا۔ وہ دراصل عربوں کی شجاعت، فیاضی، مہمان نوازی اور انتقامی جذبہ کی ایک منظوم تاریخ تھی۔ عربوں کی خوبیوں اور ان کے جذبات کی صحیح عکاس تھی مہلہل کی شاعری عربوں کی جنگ وجدل کی تاریخ بھی تھی اور منظوم افسانہ بھی۔ امرؤ القیس کی شاعری جذباتیت، الفاظ کی شان وشوکت، عربی محاورات کا استعمال اور عشق ومحبت کے جذبے کی گہرائی اور گیرائی کا اظہار ہے۔ عربی شاعری کا یہ دور تخیل کی بلندی، حالات کی عکاسی اور اسلوب بیان کی تکمیل اور تکنیک کے اعتبار سے اپنے بام عروج پر پہونچ چکا تھا اس دور کی شاعری سے عربوں کا صحیح کیریکٹر ہمارے سامنے آتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ عربی شاعری کا یہ دور سب سے اعلیٰ وارفع تھا تو کسی طرح بھی قابل تردید نہ ہوگا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس دور میں فطری جذبات کی فراوانی کے اظہار پر کوئی قید وبند نہیں تھی۔

اسلامی دور میں شاعر کے قلم اور زبان پر شرعاً پابندیاں عائد ہوگئی تھیں اس لیے جذبات کی فراوانی اور ان کے بے باک اظہار کا امکان کم ہوگیا تھا۔ شاعری پر قیود نے

جذبات کی فکری عکاسی کو روکا اس لیے زبان اور اظہار بیان کے اعتبار سے اس دور کی شاعری میں جاہلی دور کے اثرات کم ہو گئے۔ اس دور میں جذبات اور اظہار کی عکاسی کا وہ طرز نہیں رہا جو جاہلی دور کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

اس کے بعد تیسرا دور آیا جس میں زندگی مہذب ہو چکی تھی۔ قبائلی زندگی بدل کر شہری زندگی ہو گئی تھی۔ آبادی کی زیادتی، شہروں کی مصروف زندگی کے سبب بدوی زندگی کی روایات کی کمی ہو چکی تھی، لیکن شعرا نے شاعری میں اثر پیدا کرنے کے لیے جاہلی روایات کو پھر زندہ کیا اور جاہلی دور کے شعرا کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ لہذا شاعری میں تصنع اور تکلف پیدا ہوا اور شاعر اپنے دور کی زندگی کے عکاس ہونے کے بجائے دورِ جاہلیت کی زندگی کی عکاسی کرنے لگے جو نہ اس دور کے شاعر کے اِرد گِرد موجود تھی اور نہ اس زندگی سے اس کا کوئی واسطہ تھا، اس کی وجہ سے اس دور کی شاعری روایتی شاعری بن گئی۔

یہ دور عربی شاعری ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر زبان کی شاعری کو اس دور کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب وہ حقیقت سے دور ہو کر روایات سے قریب ہو جاتی ہے۔ ابونواس نے شاعری کے بے روح اور روایتی اندازِ بیان کو چھوڑ کر بیان اور اسلوب کا نیا انداز اختیار کیا اور غیر موجود بدوی زندگی کے بجائے اپنے سامنے کی اور عباسی عہد کی زندگی کا مرقع پیش کیا اس لیے وہ دربارِ بغداد اور اس کے دور کی زندگی اور ماحول کی ترجمان بن گئی ہے۔ غرض ابونواس ان شاعروں میں سے ہے جنھوں نے روایتی انداز کے بجائے شاعری کو حقیقت سے قریب کیا۔ وہ عظیم شاعر تھا اس لیے اس نے کسی ایک طبقہ کی زندگی تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا بلکہ مختلف طبقوں کی ترجمانی کی۔



ابوعبیدہ کی رائے میں ابونواس اپنے دور کا عظیم ترین شاعر ہے اور اس کا اپنے دور کی شاعری میں وہی مقام ہے جو دورِ جاہلی میں امرؤ القیس کا مقام تھا۔ ابوعبیدہ مزید کہتے ہیں کہ یمن نے تین عظیم شاعر پیدا کیے۔ امرؤ القیس، حسان اور ابونواس۔ شراق تروانی کی رائے میں ابونواس عظیم شاعر ہے، اس نے قدیم شعرا کی روش ترک کر کے مزاح کا راستہ اختیار کیا۔ اس کی وجہ سے عوام نے اس کی شاعری کو پسند کیا لیکن مزاح کی وجہ سے اکثر ادبی خوبیاں نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ قطبی نے کہا ہے کہ لوگ امرؤ القیس کو سب سے بڑا شاعر کہتے ہیں لیکن میں ابونواس کو سب سے بڑا شاعر مانتا ہوں۔ ابوتمام سے شعرائے عرب کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ ابونواس اور ابومسلم بن ولید میرے لیے لات اور عزیٰ ہیں۔ میں ان دونوں کی مدح سرائی کرتا ہوں۔ عباسی دور کے مشہور فلسفی نظام نے ابونواس کے یہ اشعار سن کر کہا کہ ابونواس عرب قوم کا سب سے بڑا شاعر ہے۔

ترکت منی قلیلاً     من القلیل اقلا

یکاد لا یتجزنی     اقل فی اللفظ من "لا"

مشہور انشا پرداز اور ماہر نقاد جاحظ کا بیان ہے کہ میں بشار کے بعد ابونواس کو سب سے بڑا شاعر مانتا ہوں۔ ابوالعتاہیہ ابونواس کے ان اشعار کی بنا پر اس کو سب سے بڑا شاعر کہتا ہے۔

اذا نحن اثنینا علیک الصالح     فانت الذی نثنی وفوق الذی نثنی

وان جرت الالفاظ یوماً بمدحته     لغیرک انسانا فانت الذی نثنی

ابونواس نے خود اپنے بارے میں کہا ہے کہ میں قدما کے مقابلہ میں چھوٹا ہوں لیکن

ہمعصروں اور مستقبل کے آنے والے شاعروں میں بڑا ہوں۔

## مزاح اور خمریات پر مشتمل شاعری

عظیم شاعر کی حیثیت سے ابونواس نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے اور سب میں بہترین اشعار کا ذخیرہ چھوڑا ہے لیکن اسکی شاعری میں خمریات اور طنز و مزاح کا حصہ زیادہ اہم ہے، اس کا اسلوب بیان جدید ہونے کے ساتھ ہی قدیم شاعری کی پختگی کا حامل بھی ہے خصوصاً اس کی خیال آفرینی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ابونواس کو خود بھی احساس تھا کہ خمریات کی شاعری میں اپنی برتری کا اندازہ تھا۔ کہتا ہے۔

| | |
|---|---|
| اشعاری فی الخمر لم یُقل مثلها | واشعاری فی الغزل فوق اشعار الناس |

شراب کی تعریف میں اور اس کی خوبیاں بیان کرنے میں اس کے مندرجہ ذیل اشعار کافی اہمیت رکھتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| فتمشت فی مفاصلهم | کتمشی البرء فی السقم |
| فعلت فی البیت اذا مزجت | مثل فعل الصبح فی الظلم |
| فاهتدی ساری الظلام بها | کاهتداء السفر بالعلم |

(یہ (شراب) اعضاء میں رفتہ رفتہ اس طرح اثر پیدا کرتی ہے جیسے کہ صحت بتدریج بیمار جسم میں۔ یہ مسافر کی ایسی رہنمائی کرتی ہے جیسے جھنڈا (علم) مسافر کی رہنمائی کرتا ہے)

شراب کی تعریف اور شاعرانہ حسن بیان اشعار ذیل اپنی مثال آپ ہیں۔

| | |
|---|---|
| شجانی وابلانی تذکر من اهوی | والبسنی ثوبا من الضر والبلوی[2] |
| یدل علی ما الضمیر من الفتی | تقلب عینیه الی شخص من یهوی |
| وما کل من یهوی هوی هو صادق | اخو الحب نضو لا یموت ولا یحیا |



| | |
|---|---|
| خطبنا الی الدهقان بعض بناته | فزوجنا منهن فی خدره الکبری |
| وما زال یغلی مهرها ویزیده | الی ان بلغنا منه غایته القصوی |
| رحیقا ابوها الماء والکرم امها | وحاضنها حر الهجیر اذا یحمی |
| لنا اکنها دن به القار مشعر | اذا برزت منه فلیس لها مثوی |
| یهودیة الانساب سلمة القری | شامیة المغزی عراقیة المنشا |
| مجوسیة قد فارقت اهل دینها | لبغضتها النار التی عندهم تکوی |
| رات عند نا ضوء السراج فراعها | فما سکنت حتی امرنا بها تطفی |
| وبینا تراها فی الندامی اسیرة | اذا انه فعت فیهم فصاروا لها اسری |
| اذا اصبحت اهدت الی الشمس سجدة | وتسجد اخری حین تسجد للمسری |

(ترجمہ: میرے محبوب کی یاد نے میری حالت خستہ کر دی ہے اور مجھے افلاس کا لباس پہنا دیا ہے۔ آدمی کے دلی جذبات کا اظہار آنکھوں کی حرکت سے ہوتا ہے جو کسی محبوب کی طرف دیکھتی ہیں۔ ہر عاشق صادق نہیں ہوتا۔ عاشق صادق تھکے ہوئے اور پریشان حال اس اونٹ کی طرح ہے جو نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے۔ ہم نے ایک دہقان سے اس کی بیٹی کے لیے پیغام دیا تو اس نے ہمیں سب سے بڑی بیٹی دینا منظور کیا۔ وہ بوڑھی تھی، پانی اس کا باپ تھا اور شراب اس کی ماں تھی اور گرمی کی دوپہر کی دھوپ نے اس کی پرورش کی تھی۔ وہ پالش شدہ گھڑے میں رہتی ہے، وہ نسلاً یہودی رہائش کے اعتبار سے مسلمان، بنیادی طور پر شامی ہے اور اس کی پرورش عراق میں ہوئی ہے۔ وہ مجوسی تھی لیکن اس نے اپنی قوم کو چھوڑ دیا، اس کی دشمنی کی بنا پر جس کی وجہ سے انہوں نے آگ روشن کی تھی۔ جب تم اسے میخوار دوستوں میں بطور قیدی کے دیکھتے ہو پھر وہ جب

ان پر اثر انداز ہوتی ہے (پینے کے بعد) تو وہ اس کے قیدی ہو جاتے ہیں۔ وہ صبح کے وقت سورج کی پرستش کرتی ہے، شام کے وقت جب وہ سفر پر روانہ ہوتی ہے تو عبادت کرتی ہے۔ اس کی لذتوں سے پینے والوں کے نفوس مر جاتے ہیں، روحیں زندہ رہتی ہیں اور جسم مردہ ہو جاتے ہیں۔ یہ (شراب) پرانی ہے جس کی چمک بجلی کی چمک کی طرح ہے، یہ ان آنکھوں کو بھی روشنی دیتی ہے جو اپنی بصارت کھو چکی ہوتی ہیں۔ جب اس میں پانی ملایا جاتا ہے تو اس میں حباب اٹھتے ہیں جو ایسے ہوتے ہیں جیسے مختلف سائز کے موتی۔ جب اس کو ہلایا جاتا ہے تو اس کی خوشبو بڑھ جاتی ہے اور اس خواہش کی طرح ہو جاتی ہے جو کوئی اپنے محبوب سے رکھتا ہے)

ذیل کے اشعار میں بھی وہ شراب کی خوبیاں ماہرانہ انداز کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

عاذلی فی المدام غیر نصوح     لاتلمنی علی شقیقۃ روحی

لاتلمنی علی التی فتنتنی     وارتنی القبیح غیر قبیح

قھوۃ تترک الصحیح سقیما     وتعیر السقیم ثوب الصحیح

ان بذلی لھا کبذل جواد     واقتنائی لھا اقتناء شحیح

(ترجمہ: تم مجھے ملامت کرتے ہو لیکن تم میرے خیر خواہ نہیں ہو۔ مجھے میری روح کے ایک حصہ کے خلاف ملامت نہ کرو۔ مجھے ایسی بات کے لیے ملامت مت کرو جس نے مجھے جذب کر لیا ہے اور مجھے بری چیز کو بھی اچھا کر کے دکھاتا ہے۔ یہ وہ قہوہ ہے جو بیمار کو بھی تندرست کر دیتا ہے اور بیمار کو تندرستی کا لباس پہنا دیتا ہے۔ میں اس پر اپنا روپیہ فیاض آدمی کی طرح خرچ کرتا ہوں اور بخیل کی طرح اس کی حفاظت کرتا ہوں)۔

ایک مرتبہ ابن الاعرابی نے کچھ لوگوں سے دریافت کیا کہ خمریات میں ابونواس کا



سب سے اچھا شعر کون سا ہے؟ ایک شخص نے کہا۔

اذا عب فیھا شارب القوم خلتہ     یقبّل فی داجٍ من اللیل کوکبا

(ترجمہ: جب کوئی شخص شراب پیتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ اندھیری رات میں ستاروں کو بوسہ دے رہا ہے)

دوسرے نے یہ شعر سب سے اچھا قرار دیا۔

کان صغری وکبری من فواقعھا     حصباء دُر علی ارضٍ من الذھب

(ترجمہ: جام شراب پر چھوٹے چھوٹے حباب سنہری سطح پر موتی جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں)

تیسرے نے یہ شعر پڑھا اور اس شعر کو ابونواس کا سب سے اچھا شعر بتایا۔

تری حیث ما کانت من البیت مشرقاً     ومالم یکن فیہ من البیت مغربا

(ترجمہ: شراب پینے کے بعد آدمی کو اپنے گھر میں یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ مشرق کدھر ہے اور مغرب کدھر ہے)

چوتھے شخص نے اس شعر کو بہترین قرار دیا۔

فکان الکؤوس فینا نجوم     دائرات بروجھا اید ینا

(ترجمہ: جام شراب ہمارے ہاتھوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چلتا ہوا ستارہ اور ہمارے ہاتھ ایسے ہیں جیسے قلعہ)۔

پانچویں نے کہا کہ شراب کی تعریف میں ابونواس کا سب سے اچھا شعر یہ ہے۔

صفراء لا تنزل الاحزان ساحتھا     لو مسھا حجر مستہ سراء

(ترجمہ: زرد شراب ایسی ہے کہ رنج و غم اس کے قریب نہیں آتا۔ اگر پتھر بھی اسے

پھوتاہے تو بھی مسرور ہوجاتاہے)

ابن الاعرابی نے کہا کہ یہ سب اشعار اس شاعر کے ہیں جو اپنے سے پہلے اور بعد کے شاعروں پر گوئے سبقت لے گیا ہے۔ لیکن اس کا سب سے اچھا شعر یہ ہے۔

لا ینزل اللیل حیث حلت فدھر شرابھا نہارُ

(ترجمہ: یہ (شراب) جہاں قیام کرتی ہے وہاں رات کبھی نہیں آتی۔ میخوار کی زندگی ایک طویل روشن دن کی طرح ہوتی ہے۔)

ابونواس آداب مے نوشی کے بارے میں لکھتاہے۔

فاذا خلوت یشربھا فی مجلس فاکفف لسانک عن عیوب الناس[۴]

فی الکاس مشغلۃ وفی لذتھا فاجعل حدیثک کلہ فی الکاس

صفو العاشر فی مجانبۃ الاذی وعلی اللبیب بخیر الجلاس

(ترجمہ: جب شراب کی مجلس میں آؤ تو اپنی زبان کو روکو اور کسی کی عیب جوئی نہ کرو۔ شراب کا جام اور مزہ ایسا مزہ ہے کہ اگر تم باتیں کرو تو صرف اس کے بارے میں اور کچھ نہیں۔ پُرسکون زندگی گزارنے کے لیے الجھنوں سے بچنا ضروری ہے اور ہر ذی عقل اچھے لوگوں کی زندگی پسند کرتا ہے)

خمریات کے سلسلہ میں ابونواس کے مندرجہ ذیل اشعار بھی پیش کیے جاسکتے ہیں۔

الا فاسقنی خمراً وقل لی ھی الخمر ولا تسقنی سراً اذا امکن الجھر[۵]

فعیش الفتی فی سکرۃ بعد سکرۃ فان طال ھذا عندہ قصر الدھر

وما الغبن الا ان ترانی صاحیاً وبالغنم الا ان یتعتعنی السکر

فبح باسم من تھوی ودعنی من الکنی فلا خیر فی اللذات من دونھا ستر



(ترجمہ: جب مجھے شراب دو تو علانیہ دو اور کہو کہ یہ شراب ہے۔ جب اعلان ممکن ہو تو رازداری نہ برتو۔ ایک جوان کی زندگی مدہوشی پر مدہوشی میں رہتی ہے اگر یہ جاری رہتی ہے تو اس کی زندگی کم ہوجاتی ہے۔ سوائے اس کے کوئی نقصان نہیں ہے کہ مجھے سنجیدہ اور میرا نشہ اترا ہوا دیکھو! میرے سامنے میرے محبوب کا نام صاف صاف لو، اس کے خطاب وکنیت کو چھوڑ کوئی مزہ نہیں ہے اگر وہ حجاب کے پیچھے ہو)

ابونواس کی شاعری کے بیشتر حصہ سے اس کی غیر سنجیدگی اور عیش پرستی ظاہر ہوتی ہے، وہ کہتا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ بڑھاپے میں پُروقار اور سنجیدہ ہونا چاہیے، مگر شکر ہے کہ میری زندگی ایسی نہیں ہے۔

یقولون فی الشیب الوقار لاھلہ وشیبی بحمد اللہ غیر وقار

ولقد ابیت علی السریر منعماً ما بین غانیۃ و غلام

ابکیھا ویبکیننی و ابکیہ التذ من خلف وقدام

وناھدۃ الثدیین من خدم القصر سبتنی بحسن الجید والوجہ والنحر

**زہدیہ** ابونواس کا شمار خمریات کے اہم شاعروں میں ہوتاہے، تاہم آزادی، بیباکی، رندی اور عیش پرستی کے ساتھ ہی اس کے یہاں زہدیہ اشعار بھی ملتے ہیں جو ادب عالیہ میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔ ابوالعتاہیہ کو اس کے یہ اشعار بہت پسند تھے۔

الا رب وجہ فی التراب عتیق یا رب وجہ فی التراب رقیق

فقل لغریب الدھر انک راحل الی منزل نائی المحل سحیق

وما الناس الا ھالک ابن ھالک وذو نسب فی الھالکین عریق

اذا امتحن الدنیا لبیب تکشفت لہ عن عدو فی ثیاب صدیق

(ترجمہ: بہت سے چہرے مٹی میں مل کر خراب ہوچکے ہیں اور بہت سے حسین چہرے مٹی میں مل کر اپنا حسن کھو چکے ہیں (جو لوگ) تمہارے قریب ہیں ان سے کہدو کہ تمہیں بھی ایسے مقام پر چلا جانا ہے جو بہت دور ہے۔ لوگ ختم ہو گئے ہیں اور ان کے بیٹے بھی ختم ہو گئے ہیں حالانکہ ان میں بڑی عظمت والے بھی تھے۔ جب کوئی ذی عقل دنیا کو دیکھتا ہے تو اس کو پتہ چلتا ہے کہ دنیا ایک ایسی دشمن ہے جو دوستی کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے)

خلیفہ المامون نے اس کے آخری شعر کی بہت تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ اگر دنیا خود بھی اپنی تعریف میں گویا ہوتی تو اس سے بہتر طریقہ پر وہ اپنا بیان نہیں کرسکتی تھی[۱۵]۔

دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کو کتنے شاندار اور موثر پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| لدوا للموت وابنوا للخراب | فکلھم یصیر الی ذھاب |
| الا یا موت لم ارمنک بدا | فسوت فما تکف وما تحابی |
| کانک قد ھجمت علی حیاتی | کما ھجم المشیب علی الشباب |
| وانک یا زمان لذو صروف | وانک یا زمان لذو انقلاب |
| وھذا الخلق منک علی وفاز | وارجلھم جمیعاً فی الرکاب |
| وموعد کل ذی عمل وسعی | بما اسدی غدا دار الثواب |
| تقلدت العظام من الخطایا | کانی قد امنت من العقاب |
| ومھما دمت فی الدنیا حریصاً | فانی لا اوفق للصواب |
| ساسال عن امور کنت فیھا | فما عذری ھناک وما جوابی |
| بایۃ حجۃ احتج یوم ال | حساب اذا دعیت الی الحساب |
| ھما امران فوز ام شقاء | الا فی حین انظر فی کتابی |



| | |
|---|---|
| فاما ان اخلد فی نعیم | واما ان اخلد فی عذاب |

(ترجمہ: پیدائش موت کے لیے ہوتی ہے اور تعمیر تخریب کے لیے۔ سب زندوں کو معدوم ہوجانا ہے۔ اے موت! تجھ سے کوئی بچاؤ نہیں نظر آتا تو کتنی سخت ہے کہ تجھ سے بچنے کا کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ تو نے مجھے ایسے گھیر لیا ہے جیسے بڑھاپا جوانی کو گھیر لیتا ہے۔ زمانہ بڑی تبدیلیوں اور انقلاب والا ہے۔ سب لوگ یہاں سے جدا ہونے والے ہیں، ان کے پاؤں رکاب میں ہیں۔ ہر آدمی کا عمل وعدے کے مطابق کل اس کو مل جائیگا۔ اور وہی اس کا بدلہ اور معاوضہ ہوگا۔ میری ہڈیاں گناہوں میں ایسی جکڑی ہوئی ہیں کہ جیسے مجھے سزاؤں سے محفوظ کردیا گیا ہو۔ میں جب تک دنیا میں زندہ رہوں گا حریص اور لالچی کی طرح رہوں گا اور مجھے نیک کاموں کا موقع نہیں مل پائے گا۔ مستقبل قریب میں جب میرے اعمال اور افعال کے بارے میں سوال کیا جائے گا تو میرے پاس جواب اور عذر کیا ہوگا! حساب اور فیصلہ کے دن جب مجھے بلایا جائے گا تو میرے پاس اپنے اعمال کی کیا حجت اور عذر ہوگا! دو چیزیں ہوسکتی ہیں یا مجھے نجات مل جائے یا مجھے سزا ملے گی جب میں اپنا نامہ اعمال دیکھوں گا۔ یا میں جنت میں رہوں گا یا میں ہمیشہ عذاب میں رہوں گا)

ایک اور موقع پر کہتا ہے[۱۶]

| | |
|---|---|
| اذا ما خلوت الدھر یوماً فلا تقل | خلوت ولکن قل علی رقیب |
| ولا تحسبن اللہ یغفل ساعۃ | ولا ان ما یخفی علیہ یغیب |
| لھونا لعمر اللہ حتی ترادفت | ذنوب علی آثارھن ذنوب |

(ترجمہ: جب تم کوئی فعل تنہائی میں بھی کرو تو یہ مت کہو کہ میں اکیلا ہوں بلکہ یہ سمجھو

کہ محافظ اور نگراں تمہارے پاس موجود ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ اللہ کسی گھڑی غافل ہوتا ہے اور یہ بھی نہ سمجھو کہ جو باتیں اس سے چھپائی جاتی ہیں وہ اس سے چھپی رہتی ہیں۔ جب زندگی لمبی ہوجاتی ہے تو اس میں گناہ کے بعد گناہ کا اضافہ ہوتا رہتا ہے)

ذیل کے اشعار سے ابونواس کے موحد ہونے کا پتہ چلتا ہے اور اس کے عقاید بھی معلوم ہوتے ہیں اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ کس اخلاقی زندگی کی تبلیغ کرنا چاہتا ہے [۵۹]

یا نفس خافی اللہ واتئدی    واسعی لنفسک سعی مجتهد

من کان جمع المال همته    لم یخل من غم و من نکد

یا طالب الدنیا لیجمعها...    جمعت بک الآمال فاقتصد

واراک ترکب ظهر مطمعة...    تطوی بها بلدا الی بلد

لولم تکن للہ متهما...    لم تمس محتاجا الی احد

والحرص یفقر اهله حسداً    والرزق اقصی غایة الحسد

اوما تری الآجال راصدة    لتحول بین الروح والجسد

واذا المنیة امت احداً    لم تنصرف عنه ولم تحد.

الموت ضیف فاستعد له    قبل النزول با فضل العدد

واعمل لدار انت جاعلها    دار المقامة آخر الامد

یا نفس موردک الصراط غداً    فتاهبی من قبل ان ترمدی

ماحجتی یوم الحساب اذا    شهدت بما جنیت یدی

(ترجمہ: اے میرے نفس! اللہ سے ڈر، تیاری اور کوشش کر جس طرح کوشش کرنے والے اپنے لیے کوشش کرتے ہیں۔ مال جمع کرنے کی خواہش رکھنے والا تکلیف اور پریشانی



سے خالی نہیں رہتا۔ دنیا کو جمع کرنے کے خواہش مند کی خواہشات کبھی پوری نہیں ہونگی اس لیے تم کو درمیانی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ میں تجھے خواہشات کی سواری پر سوار دیکھتا ہوں جس کے لیے تم ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف گھومتے رہتے ہو، اگر تمہیں خدا کے بارے میں شبہ نہیں ہے تو تو محتاج بن کر کسی دوسرے کے سامنے مت جا۔ حرص حسد کی بنا پر حریص کو فقیر بنا دیتی ہے اور حسد کی آخری خواہش رزق کا حصول ہوتا ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ موت آنے والی ہے اور وہ تیرے جسم اور روح کے درمیان حائل ہوجانا چاہتی ہے۔ جب موت کسی کو تلاش کرتی ہے تو وہ نہ تو اس سے اپنا رخ بدلتی ہے اور نہ کبھی ناکام واپس جاتی ہے۔ موت مہمان ہے۔ اس کے آنے سے قبل ہی اس مہمان کے لیے بہترین تیاری کر۔ اور اس مکان کے لیے تیاری کر جس میں تم جانے والے ہو۔ اے میرے نفس کل تجھ کو پل صراط سے گزرنا ہے سو اس پر گزرنے سے پہلے ہی اس کے لیے تیاری کرلے۔ فیصلہ کے روز میری حجت کیا ہوگی جب میرے خلاف میرے ہاتھ ہی گواہی دیں گے)

ابونواس کے اشعار سے یہ بات بخوبی ثابت ہے کہ وہ ایمان بالغیب بھی رکھتا ہے اور یوم حساب کا بھی قائل ہے اور اس کو یہ بھی یقین کامل ہے کہ انسان کو اپنے اعمال کا جواب بھی دینا ہے اور دنیا کے ساتھ ساتھ خدا کے غفور و رحیم ہونے کا پورے اعتماد کے ساتھ قائل ہے۔ اس پر زندیق یا مرتد ہونے کے الزامات سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں اس کی رندی کے اشعار سے اس کے عقاید کو طے کرنا بالکل غلط ہے۔

ابوالعتاہیہ نے زہد پر اس کے اشعار کی تعریف کی ہے اور آخرالذکر تین اشعار کے بارے میں کہا ہے کہ ان اشعار کے مقابلہ میں زہد پر اس کے بیس ہزار اشعار بے وزن ہیں۔

یا نواسی توقر وتعز و تصبر

ساءک الدھر بشئ وبما اسرک اکثر

یاکبیر الذنب عفو اللہ من ذنبک اکبر

اکبر الاشیاء عن اصغر عفو اللہ اصغر

لیس للانسان الا ما قضی اللہ وقدر

لیس للمخلوق تد بیر بل اللہ المدبر

(ترجمہ: اے ابونواس! اب تو سنجیدگی اختیار کر اور صبر کر۔ تجھے دنیا نے مسرت بخش چیزوں کی وجہ سے خراب کر دیا ہے۔ اے بہت زیادہ گناہوں کے مرتکب! خدا کا عفو تیرے گناہوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ بڑے گناہوں کے مقابلے میں اس کا چھوٹے سے چھوٹا عفو کافی ہے۔ انسان کے اختیار میں کچھ نہیں ہے سوائے ان چیزوں کے جو اللہ نے اس کے لیے مقدر کر دی ہیں۔ مخلوق کی کوئی تدبیر کارآمد نہیں ہے بلکہ دراصل اللہ ہی تدبیر کرنے والا ہے۔

**ھجو** | ابونواس گو ہجو کا شاعر نہیں تھا تاہم اس نے ہجویہ اشعار بھی کہے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

انت من طی ولکن قبلہ نون وباء

اس شعر میں ہیثم ابن عدی کی ہجو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم قبیلہ 'طے' کے تو ہو لیکن تمہارے 'طے' سے پہلے 'ن' اور 'ب' لگے ہوئے ہیں یعنی نبطی ہو۔

قل لمن یدعی سلیمی سفاھا لست منھا ولا قلامۃ ظفر

انما انت من سلیمی کواو الحقت فی الھجاء ظلما بعمرو



ان اشعار میں اشجع سلمی کی ہجو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جو شخص بیوقوفی سے خود کو 'سلمی' کہتا ہے اس سے کہہ دو کہ تیرا 'سلمی' سے ناخن کے برابر بھی رشتہ نہیں ہے۔ صرف اس 'و' جیسا رشتہ ہے جو عمر سے 'عمرو' کے واؤ کا ہوتا ہے۔

اذا انشد داود فقل احسن بشار

لہ من شعر الغث اذا ما شاء اشعار

وما منھا لہ شئ الا ھذا ھو العار

جب داؤد تمہارے سامنے بشار کے شعر پڑھے تو کہو "بشار نے کتنا اچھا کہا ہے" اور خود اس کے اشعار میں کھوٹے اور برے بھلے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

**محاکات** | ابونواس کو واقعات کی عکاسی اور تصویر کشی میں بھی کمال حاصل تھا ذیل کے اشعار اسکی بہترین مثال ہیں۔

نھضت عنھا القمیص لصب ماء فورد وجھھا فرط الحیاء

وقابلت الھوی وقد تعرت بمعتدل ارق من الھواء

ومدت راحتہ کالماء منھا الی ماء معد فی الدناء

فلما ان قضت وطرا وھمت علی عجل الی اخذ الرداء

رأت شخص الرقیب علی التدانی فاسبلت الظلام علی الضیاء

وغاب الصبح منھا تحت لیل وظل یقطر الماء فوق ماء

فسبحان الالہ وقد براھا کاحسن ما یکون من النساء

(ترجمہ: محبوبہ نے نہانے کے لیے اپنا قمیص اتارا۔ حیا اور شرم سے اس کا چہرہ گلابی ہوگیا۔ اس نے ہوا سے مقابلہ کیا اور ہوا کے مقابلے میں اس کا جسم زیادہ

نرم ونازک تھا۔ اس نے اپنے پیر پھیلائے تاکہ برتن سے پانی لے۔ اس کے پیر پانی کے مقابلہ میں زیادہ شفاف تھے۔ نہانے سے فارغ ہوکر اس نے اپنا ہاتھ جلدی سے چادر کی طرف کھینچا۔ تب اس نے اچانک ایک شخص کو جھانکتے ہوئے دیکھا، اسی وقت اس نے سیاہی کو سفیدی پر ڈال دیا یعنی سیاہ بالوں کو سفید چہرہ پر کر دیا۔ اور رات کے اندھیرے میں صبح کی روشنی غائب ہوگئی اور پانی پہ پانی گرنے لگا یعنی سفید اور شفاف جسم پر پانی کے قطرے گرنے لگے۔ ساری تعریف خدا کی ہے جس نے ایسی حسین اور خوب رو عورت پیدا کی۔)

ایک بار ایک لڑکی تین رنگوں سُرخ، سفید اور سیاہ کا لباس پہنے تھی۔ ابوالعتاہیہ دعبل اور ابونواس تینوں نے اس کے لباس کے رنگوں کے بارے میں شعر کہے، ان دونوں کے مقابلے میں ابونواس کے اشعار زیادہ شان وشوکت رکھتے ہیں۔

ابوالعتاہیہ نے سفید رنگ کے بارے میں کہا:

تبدی فی ثیاب من بیاض　　　باجفان والحاظ مراض

(ترجمہ: وہ سفید لباس میں نظر آئی اور اس کی آنکھیں اور پلک بیمار تھے)

فقلت لہ عبرت ولم تسلم　　　وانی منک بالتسلیم راضی

(میں نے اس سے کہا کہ تم بغیر سلام کے گزر گئیں لیکن میں تمہیں سلام کرنے کے لیے تیار ہوں)

تبارک من کسی خدیک وردا　　　وقدک میل اغصان الریاض

(کتنی بابرکت ہے وہ ذات جس نے تیرے گالوں کو گلابی اور تیرے اعضاء کو ہرے پودوں کی ڈالیوں سے زیادہ نرم ونازک بنا دیا)



فقال نعم کسانی اللہ حسنا　　　ویخلق مایشاء بلا اعتراض

(اس نے کہا مجھے اس نے حُسن کا لباس پہنایا ہے اور وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا)

فثوبی مثل ثغری مثل نحری　　　بیاض فی بیاض فی بیاض

(میرا لباس ایسا سفید ہے جیسے میرے دانت اور میری گردن اور یہ سفیدی میں سفیدی میں سفیدی ہے یعنی لباس دانت اور گردن تینوں سفید ہیں)

دعبل سیاہ رنگ کے متعلق کہتا ہے۔

تبدی فی السواد فقلت بدراً　　　تجلی فی الظلام علی العباد

(وہ سیاہ لباس میں نظر آئی تو میں نے کہا تو سیاہ لباس میں ایسی نظر آتی ہے جیسے سیاہی میں لوگوں کو چاند کا جلوہ نظر آتا ہے)

فقلت لہ عبرت ولم تسلم　　　واشمت الحسود مع الاعاد

(میں نے کہا تم گزریں مگر سلام نہیں کیا، تم نے میرے حاسدوں اور دشمنوں کو خوش کیا)

تبارک من کساخدیک ورداً　　　مدی الایام دائم بلا نفاد

(مبارک ہے وہ ذات جس نے تیرے گالوں کو گلابی بنا دیا اور وقت گزرتا چلا جاتا ہے)

فقال نعم کسانی اللہ حسناً　　　ویخلق مایشاء بلا عناد

(اس نے کہا اللہ نے مجھے حسن کا لباس پہنایا ہے اور وہ جیسا چاہتا ہے کرتا ہے)

فثوبک مثل شعرک مثل حظی　　سواد فی سواد فی سواد

(تیرا لباس کالا ہے جیسے تیرے بال اور جیسا میرا نصیب اور یہ سیاہی میں سیاہی میں سیاہی ہے۔)

ابونواس نے حسب ذیل اشعار میں سُرخ لباس کی تعریف کی ہے۔

تبدی فی قمیص اللاذ یسعی　　عدوٌّ لی یلقب بالحبیب

(وہ لاذ کی قمیص پہنے دوڑتی نظر آئی جو میری دشمن ہے اور اس کا لقب میری محبوبہ ہے یعنی میری محبوبہ سمجھی جاتی ہے)

فقلت من التعجب کیف ھذا　　لقد اقبلت فی زی عجیب

(میں نے تعجب سے اس سے کہا کہ یہ کیا ہے کہ تم عجیب لباس میں نظر آرہی ہو)

احمرة وجنتیک کستک ھذا　　ام انت صبغتہ بدام القلوب

(کیا تمہارے گالوں کی سرخی نے تمہارے لباس کو سُرخ کر دیا ہے یا تم نے دلوں کے خون سے اپنے لباس کو رنگ لیا ہے)

فقالت الشمس اھدت لی قمیصاً　　قریب اللون من شفق الغروب

(اس نے کہا کہ سورج نے مجھے یہ قمیص ہدیہ کیا ہے جو شفق کے رنگ سے زیادہ قریب ہے)

فثوبی والمدام ولون خدی　　قریب من قریب من قریب

(میرا لباس، شراب اور میرے گال قریبی قریب ہیں یعنی ایک چیز سے ایک چیز قریب ہی قریب ہے)



# اردو کی ابتدا وارتقا کے اسباب

از جناب رضوانہ معین صاحبہ، حیدرآباد

اردو ایک ہند آریائی زبان ہے اس کے موجودہ رنگ وروپ، ساخت اور مزاج سے ہم واقف ہیں مگر اس کے ابتدائی خط وخال کیسے تھے، اس کی ابتدا کب ہوئی اور یہ کیسے بنی، ان سب سوالوں کا جواب قطعی طور پر نہیں دیا جاسکتا کیونکہ یہ مسائل ہنوز حل طلب ہیں، تاہم ماہرین لسانیات کے خیال کے مطابق جدید ہند آریائی زبانوں کا آغاز تقریباً ۱۰۰۰ء سے ہوتا ہے اس سے قبل کا زمانہ سنسکرت، پالی، پراکرت اور اپ بھرنشوں کا تھا، اپ بھرنش عام زبان کے طور پر استعمال ہوتی تھی، ماہر لسانیات گریرسن نے لکھا ہے کہ:

"برعظیم کی ساری جدید زبانیں اپ بھرنش ہی کے بچے ہیں"[1]

اپ بھرنش کی مقبولیت اور اس کے حلقۂ اثر وسیع ہونے کے اسباب یہ تھے کہ سنسکرت، پراکرت اور دیگر علاقائی بولیوں سے اس نے تعلق قطع نہیں کیے بلکہ سب کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ان سب کی آمیزش کے بعد جب اس کی نشو ونما ہوئی تو:

"کوئی پشاچی اپ بھرنش کہلائی اور کوئی شورسینی اپ بھرنش کے نام سے موسوم ہوئی، کسی کا نام ماگدھی اپ بھرنش پڑا اور کسی کا اردھ ماگدھی اور مہاراشٹری

---

[1] بحوالہ جالبی جمیل ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو جلد اول، طبع اول، ۱۹۷۰ء، ص ۴۔

اپ بھرنش، ان اپ بھرنشوں میں شورسینی اپ بھرنش کا حلقۂ اثر سب سے وسیع تھا...... رفتہ رفتہ شورسینی اپ بھرنش بین الاقوامی آریائی زبان کی حیثیت سے استعمال میں آنے لگی۔"۱؎

بقول پروفیسر مسعود حسین خاں اپ بھرنش کی سب سے بڑی خصوصیت، جو بعد کو جدید ہند آریائی زبانوں نے اپنائی یہ تھی کہ اس میں سنسکرت کے تت سم (خالص) الفاظ بہت کم استعمال ہوتے تھے، مسلمانوں کی آمد نے سنسکرت کے تسوں کو اور کم کر دیا۲؎

پروفیسر گیان چند جین اپنے مقالہ "آغاز نطق سے اردو تک" میں رقمطراز ہیں:

"شورسینی اپ بھرنش سے جو زبان پیدا ہوئی اسے لسانیات کی اصطلاح میں مغربی ہندی کہا جاتا ہے، یہ پانچ زبانوں پر مشتمل ہے، ہریانی یا بانگڑو، کھڑی بولی، برج بھاشا، قنوجی اور بندیلی۔"۳؎

اردو کو مغربی ہندی کی کھڑی بولی سے ماخوذ خیال کیا جاتا ہے، زبان کے تعمیری دور میں بیرونی حملوں کے اثرات کے بارے میں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کا خیال ہے کہ:

"اگر ہندوستانی زندگی اپنے پرانے ڈھرے پر چلتی رہتی اور باہر سے اس پر شدید حملے نہ ہوتے تو ممکن ہے جدید ہند آریائی ادب کے آغاز و ارتقا میں ایک دو صدیوں کی اور تاخیر ہو جاتی۔"۴؎

---

۱؎ بحوالہ جالبی جمیل ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو جلد اول، طبع اول، ۱۹۷۷ء ص، ۲؎ مقدمہ تاریخ زبان اردو، سن طباعت ۱۹۸۰ء، علی گڑھ ص ۴، ۳؎ دلوی عبدالستار ڈاکٹر، اردو میں لسانیاتی تحقیق، سن اشاعت ۱۹۷۱ء بمبئی ص ۵، ۴؎ ہند آریائی اور ہندی، مترجم عتیق احمد صدیقی، اردو ترقی بیورو سن اشاعت ۱۹۷۷ء، ص ۲۶



اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زبان کی تشکیل و ارتقا میں لسانی رجحانات کے علاوہ سیاسی، اجتماعی، تہذیبی اور فکری عوامل بھی کارفرما ہوتے ہیں، اس لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ وہ کون سے محرکات و عوامل تھے جس نے اردو زبان کی ارتقائی رفتار میں نہ صرف تیزی پیدا کی بلکہ عربی فارسی لفظوں کے استعمال سے اس زبان کے مزاج میں انفرادیت پیدا کی۔

## تاریخی اور سیاسی اسباب

ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی تسلط کا آغاز فتح مکران ۶۴۴ء اور فتح سندھ (۷۱۲ء) سے ہوتا ہے، عربوں کے قیام اور سرکاری زبان کی حیثیت سے عربی کے استعمال کی وجہ سے عربی نے وہاں کی مقامی زبانوں کو متاثر کیا اور ان کا رسم الخط تبدیل ہو کر عربی ہو گیا۔

فارسی بولنے والے حکمرانوں کے سیاسی حملوں کا آغاز گیارہویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے اور سولہویں صدی تک قائم رہتا ہے، کئی صدیوں تک فارسی سرکاری اور درباری زبان رہی، اس دوران نہ صرف حاکموں کے تہذیبی اثرات پھیلے بلکہ ان کی زبان بھی اپنے دائرے کو وسیع کرتی رہی، حاکموں کی زبان کو قبول کرنا تقاضائے وقت بھی تھا اور سماجی و معاشی ضرورت بھی، سرکار و دربار میں وہ اپنی اصل شکل میں استعمال ہوتی رہی مگر عوام میں وہ جزوی طور پر استعمال میں آنے لگی یعنی بول چال کی زبان میں عربی اور فارسی الفاظ شامل ہونے لگے، صدیوں کے سیاسی تسلط اور حکمران طبقہ کے یہاں قیام سے یہ عمل ایک سماجی ضرورت کی شکل اختیار کر گیا، مافی الضمیر کی ادائیگی اور ادبی و شعری اظہار کے تقاضے بغیر اس کے مکمل نہ ہوتے تھے، خلاصہ کلام یہ کہ محمود غزنوی کے دور سے

مسلمان حکمرانوں کی طاقت میں برابر اضافہ ہوتا رہا یہانتک کہ مغلیہ سلطنت نے ہندوستان کو ایک سیاسی وحدت عطا کی، اس وحدت نے تمام ہندوستان میں ایک ہی طریقہ کے اجتماعی، تعلیمی، فکری اور لسانی وحدت کی فضا پیدا کی۔

**۲۔ اجتماعی اسباب** ہندوستان میں ہر مذہبی فرقے کے اپنے اپنے رسوم و قیود ہیں۔ مسلمان یہاں اسلامی تعلیمات، عدل و مساوات اور اسلامی علوم و فنون لے کر آئے، ان میں تین طرح کے لوگ تھے ایک تاجر، دوسرے فاتح و سپہ سالار تیسرے علماء و مبلغین اور صوفیہ[1]۔

ان کی آمد کے بعد سے ملک میں مسجدیں، مقبرے، سرائیں، خانقاہیں اور مدرسے قائم ہونے لگے جو اسلامی ثقافت کا مرکز تھے، اسلام اپنی خوبیوں کی وجہ سے تیزی سے پھیلنے لگا، اس کے پھیلنے کے متعدد اسباب میں ایک اہم سبب اسلام کا انسانی حقوق پر زور اور طبقاتی نظام کی مخالفت بھی ہے اس تعلق سے مسٹر ایس سی چترجی اپنے مضمون "سلاطین دہلی کی حکومت کے نتائج" میں لکھتے ہیں:

"اور جب بارھویں صدی میں اسلام آزادی و مساوات کا ڈنکا بجاتا ہوا بنگال میں پہونچا تو عوام کی طبیعتیں خود بخود اس کی طرف مائل ہوگئیں اور لوگ جوق درجوق مسلمان ہوتے چلے گئے۔"[2]

اسی سلسلے میں ڈاکٹر شمس الدین صدیقی لکھتے ہیں کہ:

"مسلمان حتی الامکان اسلامی فقہ اور شرعی احکام کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے

[1] تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، جلد ۶، اردو ادب (اول) طبع اول لاہور، ص ۔ [2] عبدالرحمن، سید صباح الدین، ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک ایک جھلک، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۵۸ء، ص ۳۳۱۔



اور ان کی مشرقی اقدار اور اجتماعی ضوابط حیات شرع محمدی پر قائم تھے اس لیے ان کا طرز زندگی ہنود کے طرز سے مختلف اور ممتاز رہتا تھا.... قبول اسلام کے معنی یہ ہوتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے روحانی و سماجی نظام میں ضم ہوکر ایک نئی زندگی شروع کرتے تھے اور نسل، زبان اور سابقہ معاشرتی اقدار کو بھول کر ملت کی وحدت میں گم ہوجاتے تھے اور ان میں ایک وحدت احساس پیدا ہوجاتا تھا اسلام ایسا مذہب ہے جو اجتماعیت پر زور دیتا ہے، اسلام کا ایک اساسی اصول عالمگیریت ہے جو مساوات اور اخوت کے تصور پر مبنی ہے۔"[1]

نئی قوم کے ساتھ نئی زبان، نیا مذہب، اس کی اصطلاحات اور ان کے نظام کے نئے نئے الفاظ بھی یہاں کے معاشرے میں اپنی جگہ بنانے لگے، پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ:

"ان کے عقائد کے ساتھ نئے لفظ بھی آئے تھے جن میں اللہ، رسول، روزہ، حج، زکوٰۃ، قرآن، حدیث، اسلام اور اس طرح کے بہت سے لفظ تھے، نیا نظم و نسق جو آیا تھا اس میں پادشاہ، حاکم، دربار، عامل، دیوان، صوبہ، صوبہ دار، تحصیل دار، خزانہ جیسے بے شمار الفاظ تھے جو اس نظم و نسق کے ساتھ رائج ہوگئے تھے عدالت و انصاف کا نیا انتظام، قاضی، منصف، عدالت، وکیل اور اس سلسلہ کے سارے تصورات نئے لفظ چاہتے تھے، فوجی تنظیم میں سپہ سالار، جمع دار، زین، رکاب جیسے لفظ آئے۔"[2]

[1] تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، جلد ۶ اردو ادب (اول)، ص ۱۲ [2] اردو کی ادبی تاریخ سری نگر، ۱۹۸۰ء، ص ۳۵۔

**۳۔ تہذیبی اسباب** انسان جہاں سکونت پذیر ہوتا ہے وہاں کے جغرافیائی حالات، آب و ہوا اور ماحول کے لحاظ سے اس کی عادات و تقالید ہوتی ہیں، اس کے مکانات، ملبوسات اور ماکولات کا خاص مذاق ہوتا ہے حتی کہ اس کے لسانی اور ادبی مذاق بھی وہاں کے ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔

عرب، ایرانی اور ترکی مسلمان جب یہاں آئے تو ان تمام تہذیبی اور تمدنی امور میں ان کا اپنا خاص مذاق تھا۔ ان کے عقائد، رسومات، عادات و تقالید اور دینی و دنیوی امور یہاں کے لوگوں سے مختلف تھے۔

جو تعمیرات ہوتی تھیں ان میں ان کا اپنا ذوق معماری بھی ہوتا تھا، مثال کے طور پر قطب مینار، لال قلعہ، تاج محل، سرائیں، خانقاہیں، مدارس اور مقابر ان کے ذوق کی عکاسی کرتے ہیں، لباس بھی یہاں کے لوگوں سے مختلف تھا جیسے پاجامہ، شلوار، شیروانی، رومال، شال، دوشالے وغیرہ اور جواہرات جیسے لعل، عقیق، زمرد وغیرہ اور زیورات میں پازیب، گلوبند اور طوق وغیرہ، کھانوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں کے ماکولات مختلف ہیں جیسے قورمہ، کباب، بریانی، فیرنی، نان، برفی، قلاقند، گلاب جامن اور شکر پارے وغیرہ۔[۱]

دونوں ملکوں اور قوموں کے تہذیبی لین دین میں یہ تمام چیزیں یہاں رائج ہوگئیں، اسلامی تہذیب نے کچھ دیا اور کچھ لیا بھی، مسلم حکومتوں کے قیام کے سبب سے ہی "ہندوستان صدیوں تک اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز رہ چکا ہے جس کے آثار اس کے ذرہ ذرہ پر ثبت ہیں"۔[۲]

---

[۱] سروری، عبد القادر، ڈاکٹر، اردو کی ادبی تاریخ ص ۵۴ [۲] عبدالحئی، مولانا سید حکیم، اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں، پیش لفظ، مطبع معارف اعظم گڈھ۔



**۴۔ لسانی و فکری اسباب** یہاں کی لسانی، ادبی اور معاشرتی سرگرمیوں کا پوری طرح احاطہ کرنے سے بخوبی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان پر عربی زبان وادب اور عربی تہذیب و تمدن کا تسلط رہا ہے۔[۱]

سندھ پر عربوں کے تسلط کے بعد سے وہاں عربی زبان اور عربی الفاظ کثرت سے استعمال ہونے لگے، محمود غزنوی کے بعد فارسی کا اثر بڑھتا گیا یہاں تک کہ عہد مغلیہ تک وہ سرکاری زبان رہی، تصنیف و تالیف کے لیے عربی و فارسی دونوں استعمال ہوتی تھیں، اس طرح سیاسی نظام، مسلم معاشرے اور تعلیم و ثقافت کے شعبوں میں عربی و فارسی الفاظ کے استعمال سے دونوں زبانیں اپنا اپنا اثر چھوڑ رہی تھیں، اگر فارسی سرکاری زبان تھی تو عربی مذہبی اور دینی بعض گوشوں میں کبھی عربی کا اثر غالب رہا اور کبھی فارسی کا، مگر فورٹ ولیم کالج کے قیام (۱۸۰۰ء) اور پھر عہد مغلیہ کے خاتمہ کے بعد فارسی کے اثرات کم ہوتے گئے اور عربی کے اثرات بڑھتے گئے۔

عہد مغلیہ (۱۵۲۶ء – ۱۸۵۷ء) میں افکار و خیالات میں وسعت پیدا ہوئی معاشرے میں فکری مدوجزر کارفرما رہا، اسلامی علوم و فنون پر زیادہ تر عربی و فارسی میں کتابیں لکھی گئیں اور ہزارہا کتابیں:

"فنون ادبیہ (نحو، صرف، اشتقاق، لغت، بلاغت، عروض، قافیہ، انشار، شعر و تاریخ) علوم شرعیہ و دینیہ (فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، تفسیر، اصول تفسیر اور تصوف) اور فنون نظریہ (علم مناظر

---

[۱] فیاض محمود، سید، تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، جلد ۲، تعارف۔

علم منطق، طبیعیات، الٰہیات، حکمت عملی، فن ریاضی اور طب) پر کتابیں لکھی گئیں[۱]

مولانا سید عبدالحئی صاحب نے اپنی کتاب "نزہۃ الخواطر" میں کچھ ساڑھے چار ہزار سے زیادہ اعیان ہندوستان کا تذکرہ کیا ہے، اسی طرح دوسری کتاب "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" میں ہندوستانی علماء اور مصنفین کی تصانیف کی ایک لمبی فہرست جو کئی ہزاروں پر مشتمل ہے، مرتب کی ہے، ان دونوں کتابوں سے ہندوستانی مسلمانوں کے لسانی اور فکری سرگرمیوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے[۲]

مولانا عبدالحئی صاحب لکھتے ہیں کہ:

"اسلامی ہند میں تعلیم و تہذیب کا معیار عربی اور فارسی کی تعلیم تھی اس لیے نومسلموں بلکہ خالص ہندوؤں میں عربی و فارسی کے بڑے بڑے ماہر مصنف پیدا ہوئے جن کی علمی و ادبی تصانیف مسلمان مصنفین کی تصانیف سے کم درجہ پر نہیں ہے[۳]"

• ہندوستان میں ان سیاسی، اجتماعی، تہذیبی اور فکری و لسانی عناصر نے خاص طور پر ایک نئے ماحول کو پیدا کرنے میں مدد دی۔

تمام مسلم فاتحین اپنی اپنی مادری زبان (عربی، فارسی، ترکی) بولتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے، گو یہاں کی زبانیں اور بولیاں ان سے بالکل جدا تھیں لیکن انہوں نے سیاسی اور کاروباری زندگی کی بقا کے لیے یہاں کی زبانوں اور

[۱] اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں، مترجم ابوالعرفان ندوی ص پیش لفظ، ۱-۲۔ [۲] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ڈاکٹر زبید احمد کی کتاب عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ [۳] اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں، مترجم ابوالعرفان ندوی، ص ب،



بولیوں کو ذریعۂ اظہار بنایا، اس کے متعلق ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں:

"یہ ایک قدرتی امر ہے کہ مسلمانوں نے یہاں کی ترقی یافتہ علمی، ادبی زبانوں (سنسکرت اور مختلف پراکرتوں: ماگدھی، اردھ ماگدھی، مہاراشٹری، پالی، شورسینی وغیرہ) کو اختیار کیا بلکہ عوامی بولیوں کی طرف بھی توجہ کی، جس زمانے میں مسلمان برصغیر میں آئے اس وقت یہاں کی زبانیں تغیر و تبدل کے اس مرحلے پر تھیں جسے ماہرین لسانیات نے جدید ہند آریائی زبانوں کے طلوع کا زمانہ کہا ہے[۱]"

بقول ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی:

"ہند آریائی زبانوں میں فارسی عربی الفاظ کی درآمد برابر جاری رہی اور یہ بالکل فطری طور پر ہوا، یہ الفاظ اب جدید ہند آریائی کا جزو بن گئے ہیں[۲]"

جدید ہند آریائی زبانوں کے تشکیلی دور میں یہی وہ اسباب و حالات تھے جنھوں نے بنتی ہوئی نئی زبانوں کو سہارا دیا اور بالخصوص اردو کے مزاج کو دوسری جدید زبانوں سے خاصا جدا کر دیا۔

محققین اور ماہرین لسانیات کی آرا اور دلیلوں کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ہند آریائی زبان ہے اور اس کی بنیاد کھڑی بولی ہے جو مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے۔ اس طرح اردو کا سلسلہ کھڑی بولی کے وسیلے سے شورسینی اپ بھرنش سے ملتا ہے، ابتدا میں اس میں کئی مقامی زبانوں کے اثرات رہے لیکن اس کا ارتقاء کھڑی بولی کے علاقوں میں ہوا جن میں میرٹھ، دہلی اور اسکے نواح کی بولیاں شامل ہیں۔

رفتہ رفتہ جب کھڑی بولی میں عربی اور فارسی لفظوں کا ارتباط قائم ہوا تو اسکے صوتی مزاج میں فرق آگیا، اس طرح ایک نئی شکل میں اردو زبان کا ارتقا ہوا جس کا لسانی مزاج دیگر ہند آریائی زبانوں سے جدا تھا۔

اس سے قبل کھڑی بولی کو خاص مرتبہ حاصل نہ تھا بلکہ یہ صرف بول چال کی سطح پر قائم تھی جب عربی فارسی کے اثرات نے اسے اردو کا لباس عطا کیا تو اس نئے خط و خال ابھر کر سامنے آئے اور اس نے معیاری زبان کا درجہ حاصل کیا۔

[۱] تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، جلد ۹، ص ۱۷۔ [۲] ہند آریائی اور ہندی، مترجم عتیق احمد صدیقی، ص ۱۲۳۔

# معارف کی ڈاک

(۱)

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی
۹ اکتوبر ۹۸ء

جناب محترم ضیاء الدین اصلاحی صاحب! السلام علیکم

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، برخوردار سید مجتبیٰ علی بریلی سے بچوں سمیت ۴ اکتوبر ۹۸ء بخیریت بذریعہ ہوائی جہاز کراچی تین ماہ کے قیام کے بعد واپس آگئے الحمدللہ۔ وہ آپ کے دفتر کے ارسال کردہ 'معارف' اعظم گڈھ کے پرچے ہمراہ لانے میں کامیاب ہوگئے۔ پہلی فرصت میں جملہ شماروں پر نظر ڈالی۔ خدا کا شکر ہے زیارت نصیب ہوئی۔ ڈاک کے اخراجات ہوش ربا ہیں ورنہ کانفرنس کی جملہ مطبوعات ارسال خدمت کر چکا ہوتا۔ ایک 'العلم' پر ۳۶ روپیہ ٹکٹ انڈیا کے واسطے لگ رہے ہیں۔ 'العلم' سہ ماہی جنوری تا مارچ ۹۸ء اور اپریل تا جون ۹۸ء یکے بعد دیگرے 'سرسید نمبر' شایع ہوئے ہیں۔ ۱ بھیجا جا چکا ہے دوسرا اس خط کے ساتھ روانہ کر رہا ہوں۔ ہو سکے تو مختصر تبصرہ سے نوازیں۔ 'دیوان زادہ شاہ حاتم' پر تبصرہ کا شکریہ۔

یہاں کے حالات افسوسناک ہیں۔ خدا کرے شرعی نظام نافذ کرنے کے ارادوں میں حاکمان وقت مخلص ہوں۔ پاکستان کا اصل مسئلہ جاگیرداری نظام اور مراعات یافتہ طبقہ ہے۔ اس عفریت نے جملہ شعبہ ہائے حیات کو متاثر کر دیا ہے۔ دعائے خیر کی ضرورت ہے۔

جان ڈیوی کی مشہور کتاب 'جمہوریت و تعلیم' حصہ اول مترجمہ سید محمد تقی امروہوی چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل کے تیسرے ایڈیشن کی تیاری جاری ہے۔ بوجوہ 'العلم' تاخیر سے



شایع ہو رہا ہے۔

عم محترم سید الطاف صاحب بریلوی حیات و خدمات آپ نے مطالعہ فرمالی ہوگی، تبصرے کا انتظار ہے۔ آں مرحوم کے علامہ سید سلیمان ندویؒ سے قریبی مراسم تھے۔ کراچی میں دو مرتبہ علامہ مرحوم و مغفور سے سید صاحب جب ملنے تشریف لے گئے تو مجھے بھی حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ علامہ سید سلیمان مرحوم کا یہ فقرہ میرے کانوں میں گونج رہا ہے کہ "یہاں لوگ آتے ہیں۔ تعریفیں کرتے ہیں۔ احترام کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں دریافت کرتا کہ سلیمان تو کیا کھاتا ہے کیسے گزارا کرتا ہے۔ افسوس ہے کہ ایسے عالم، فاضل قابل فخر ہستی کے ساتھ آخری دور میں دونوں ممالک کی جانب سے بہتر سلوک نہیں ہوا۔

آپ نے معارف میں مولانا مرحوم کے واجبات کی عدم ادائیگی کی تکلیف دہ سرگزشت کافی دن قبل شایع کر کے تاریخ کے ایک گوشہ کو محفوظ کر دیا۔ جب پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام کراچی ۱۹۵۱ء میں عمل میں آیا تو سید سلیمان ندویؒ خود سندھ مدرسۃ العلوم تشریف لائے اور نچلی منزل پر سید الطاف حسین صاحب بریلوی کو طلب کر کے 'ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں' کا مسودہ عنایت فرمایا اور کہا کہ یہ آپ کا حق ہے اسے شایع کریں اس وقت کانفرنس کا دفتر سندھ مدرسہ کے ایک بڑے کمرے میں بالائی منزل پر تھا اور سید صاحب قلب کی کمزوری کی وجہ سے سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتے تھے۔ سید صاحبؒ کی عطا کردہ کتاب کے تین ایڈیشن اردو۔ ایک انگریزی اور ایک بنگلہ زبان میں شایع ہو چکے ہیں۔ خط طویل ہو گیا اس لیے قلم روکتا ہوں۔

فقط والسلام

مخلص: مصطفیٰ علی بریلوی

(۲)

گلفشاں۔ قاضی پور خورد۔ گورکھپور

۲۵ اکتوبر ۹۸ء

محترمی و معظمی۔ سلام مسنون

والانامہ موصول ہوا۔ اچھا ہی ہوا کہ میرا خط آپ کو تاخیر سے ملا اور گورکھپور کے سیلاب کی کیفیت معارف میں شایع نہیں ہوسکی۔ کیونکہ خوشی سب میں تقسیم کی جاتی ہے اور دکھ خود برداشت کرلیا جاتا ہے۔ اپنے دکھ کو بیان کرکے دوسروں یا ہمدردوں کو دکھی کرنا نامناسب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ اس نے گورکھپور والوں کو اتنے بڑے مصائب کو برداشت کرلینے کی قوت عطا کی۔ بحمدہٖ اب حالات معمول پر آگئے ہیں۔

اکتوبر کا معارف موصول ہوا۔ اس میں جناب حبیب حق کا مضمون استدراک بہت ہی وقیع مضمون ہے۔ حبیب حق کا مطالعہ بہت وسیع معلوم ہوتا ہے اور لسانیات میں بھی ان کی مہارت کا اندازہ ہوا، انہوں نے بہت بروقت مجذوب صاحب کی "تحقیق" کی حقیقت کا پردہ فاش کیا۔ ایک عرصے سے سنسکرت کی حنوط شدہ لاش کو زندہ کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔ سنسکرت کبھی عوامی زبان نہیں رہی اور جو زبان عوامی نہیں ہوتی وہ کچھ عرصے میں اپنی موت آپ مرجاتی ہے۔

ابونواس پر بہار الحق صاحب کا مضمون بھی نظر نواز ہوا لیکن ابونواس کی پیدائش اور موت کی تاریخوں کا صحیح تعین نہیں ہوسکا۔ قاضی تلمذ حسین صاحب رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی اور مرتب مراۃ المثنوی نے ایک کتاب خمریات ثلثہ کے نام سے مرتب کی تھی جس کا کتابت شدہ مسودہ میں نے دیکھا تھا لیکن ان کے انتقال کے سبب کتاب



طبع نہیں ہوسکی۔ کئی سال سے ان کے ورثاء سے بارہا میں نے اس مسودہ کے لیے تقاضا کیا کہ اگر مل جائے تو اسے کہیں سے شایع کرادیا جائے لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کتاب میں انہوں نے تین زبانوں کے ان شعراء کا تذکرہ کیا تھا اور ان کے کلام کا انتخاب شایع کیا تھا جن کا مرتبہ خمریات میں بہت بلند سمجھا جاتا ہے یعنی عربی میں ابونواس۔ فارسی میں عمر خیام اور اردو میں ریاض خیرآبادی۔ قاضی صاحب بہت اعلیٰ پائے کے محقق تھے اس لیے امید ہے کہ ابونواس کی تاریخہائے پیدائش و موت کے بارے میں انہوں نے کافی حد تک صحیح لکھا ہوگا۔ مولانا روم کی مثنوی کو مراۃ المثنوی کے نام سے جب انہوں نے ترتیب دیا تو ان کو ایران کا سب سے بڑا ادبی انعام "نشان امتیاز" ملا تھا۔ میری ناقص معلومات کے مطابق شاید ہندوستان میں اور کسی کو یہ انعام نہیں ملا ہے۔

اردو والوں کی یہ خوش قسمتی ہے کہ معارف ایسا ماہنامہ اردو میں شایع ہوتا ہے، معارف ایک ایسا ماہنامہ ہے جس نے شروع سے آج تک اپنے اعلیٰ ادبی معیار کو برقرار رکھا ورنہ اس تجارتی دور میں بہت سے رسائل اپنے معیار کو پست کرتے چلے گئے یہاں تک کہ وہ اپنے بانی کے اغراض و مقاصد سے بہت دور پہونچ گئے۔ اللہ آپ کو صحت کے ساتھ عمر طویل عطا کرے تاکہ یہ ماہنامہ اپنے وقار اور معیار کو برقرار رکھ سکے۔

چند روز قبل میں نے انگریزی اخبار ٹائمز آف انڈیا میں خبر پڑھی کہ دو صاحبان کے علاوہ آپ کو بھی کوئی اعزاز ملا ہے۔ میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اس کا تراشہ بھیج رہا ہوں۔ دو ہندو ادیبوں کے ساتھ ایک اردو ادیب کی خدمات کو بھی خراج تحسین پیش کیا یہ باعث مسرت ہے۔ کسی صلاحیت اور لیاقت کو نظر انداز کرنا مشکل کام ہے۔

خدا کرے آپ مع لواحقین بخیر و عافیت ہوں۔

دار المصنفین کی مطبوعات کی فہرست بھجوا دیں تو ممنون ہوں گا۔ بقیہ بدستور۔

خیر اندیش : محمد حامد علی

(۳)

مہاراج نگر، لکھیم پور کھیری

۲۰ر اکتوبر ۹۸ء

جناب مکرم! السلام علیکم

گرامی نامہ، ۱ر اکتوبر ۹۸ء ملا۔ بہت بہت شکریہ! اس سے پہلے مضمون کی اشاعت کے بعد آپ کا ایک گرامی نامہ ملا تھا جس میں آپ نے مضمون میں کتابت کی غلطیوں کے بارہ میں لکھا تھا۔ میں نے اس کا جواب دیا تھا اور لکھا تھا کہ معارف پڑھنے کے بعد اس پر اپنی رائے کا اظہار کردوں گا۔ افسوس ہے کہ علالت کی وجہ سے کچھ نہ لکھ سکا۔ معارف کے مضامین پر میرا تبصرہ اسی شعر سے واضح ہوجائے گا۔

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامن دل را کشد کہ جا ایں جاست

معارف مجھے بہت پسند ہے۔ آپ کی ادارت میں اس کی شان میں اضافہ ہوا ہے۔

آپ کی آزاد پر کتاب پر جناب خلیق انجم کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ لاجواب تبصرہ ہے۔

مراد شاہ جہاں کا بیٹا تھا میں نے غلطی سے جہانگیر لکھ دیا۔ اس کا بہت افسوس ہے اور آپ سے اور قارئین معارف سے معذرت خواہ ہوں۔

معارف انشاء اللہ کل مل جائے گا۔ پھر آپ کو لکھوں گا (انشاء اللہ)، میرے لیے دعائے صحت کریں۔

نوٹ: جن لوگوں نے میرے مضمون پر اظہار خیال کیا ہے ان کا شکریہ۔

خادم : ع۔ز۔می۔



## وفیات

# امیر شریعت خامس کی رحلت

امیر شریعت خامس مولانا عبدالرحمٰن کی وفات ہندوستان خصوصاً بہار و اڑیسہ کے مسلمانوں کا نقصان عظیم ہے۔ قوم و ملت اپنے ایک بزرگ رہنما، عالم دین اور عارف باللہ سے محروم ہوگئی۔ وہ واقعی عالم باعمل اور اس دور میں زہد و اتقا، عمل و اخلاص اور اتباع سنت میں منفرد و یگانہ تھے۔ ان کی زندگی دین کی خدمت و اشاعت، دعوت و تبلیغ، وعظ و ارشاد، نفوس کی اصلاح و تزکیہ اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود میں گزری اور ان سے بے شمار لوگوں کو فیض پہونچا۔

حضرت امیر شریعت کی علالت کا سلسلہ کئی ماہ سے چل رہا تھا، افاقہ نہ ہونے کی بنا پر مدرسہ حمیدیہ گودنا (چھپرہ) سے پھلواری شریف لائے گئے اور سجاد میموریل اسپتال کے علاج سے کسی قدر حالت بہتر ہوئی مگر پھر مرض نے شدت اختیار کرلی تو کوجی کلینک پٹنہ میں داخل کیے گئے مگر وقت موعود آگیا اور یہیں ۲۹ر ستمبر ۹۸ء کو رشد و ہدایت کا یہ چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔

۳۰ر ستمبر کو ۱۱ بجے دن میں قائم مقام امیر شریعت نے پھلواری میں جنازہ کی نماز پڑھائی جس میں مختلف اضلاع کے ہزاروں سوگواروں نے شرکت کی۔ اسی روز جسد مبارک مدرسہ حمیدیہ گودنا (چھپرہ) لایا گیا جہاں عصر بعد نماز جنازہ ہوئی اور متعدد اضلاع سے آئے ہوئے ہزاروں عقیدت مندوں کی موجودگی میں مسجد کے قریب ان کی تدفین ہوئی۔

مولانا نے ۹۵ برس کی طویل عمر پائی، ان کی ولادت ضلع دربھنگہ کے ایک گاؤں میں ۱۹۰۳ء میں ہوئی تھی۔ مختلف دینی مدارس میں تعلیم پانے کے بعد مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے فضیلت کی سند لی، وہ ایک اچھے اور ذہین طالب علم تھے، فضیلت کے امتحان میں پورے بہار میں اول آئے۔ ابتدا ہی سے طبیعت طاعت و زہد کی طرف مائل تھی، تحصیل علم ہی کے زمانے سے سلوک و عرفان سے مناسبت پیدا ہوگئی تھی، بالآخر ایک شیخ وقت مولانا ریاض احمد صاحب کے دامن فیض سے وابستہ ہوئے اور خلافت سے سرفراز ہوئے۔ اپنے شیخ و مرشد کے ایما سے ۱۹۴۲ء میں مدرسہ حمیدیہ گودنا میں قیام پذیر ہوگئے، جہاں درس و تدریس کے ساتھ عام لوگوں کی اصلاح و تربیت بھی فرماتے رہے۔

امارت شرعیہ سے اس کے روز تاسیس ۱۹۲۱ء ہی سے ان کا تعلق قائم ہوگیا تھا اس کے بانی مولانا ابوالمحاسن سجادؒ کی خدمت میں باریابی کا شرف بھی حاصل کیا تھا۔ ان کی جد و جہد سے چھپرہ میں امارت کانفرنس کا انعقاد ہوا، امارت کے تنظیمی شعبہ سے ان کا ہمیشہ گہرا تعلق رہا، جس کو وہ ریڑھ کی ہڈی کہا کرتے تھے۔ مولانا عبدالرحمن صاحب اپنے پیش رو چاروں امیر شریعت کے جلسۂ انتخاب میں شریک رہے اور ان کے ہاتھوں پر بیعت کی، مولانا عبدالصمد رحمانی نائب امیر شریعت کے انتقال کے بعد اس منصب کے لیے ان کا انتخاب عمل میں آیا اور ۱۹۹۱ء میں امیر شریعت رابع مولانا منت اللہ رحمانی کی وفات کے بعد وہ امارت کے اس سب سے بڑے عہدہ پر فائز کیے گئے۔ گو مولانا عبدالرحمن صاحب کی امارت کا دور سات آٹھ برس کے قلیل زمانے کو محیط ہے، تاہم یہ بڑا زریں عہد تھا جس میں امارت کے مختلف شعبوں میں بڑی وسعت و ترقی ہوئی، مالی و انتظامی حیثیت سے بھی یہ دور مستحکم رہا۔ کئی اہم دینی، تعلیمی اور فلاحی ادارے وجود میں



آئے، سماجی خدمت، ریلیف اور راحت رسانی کے متعدد کام انجام پائے، تبلیغ و دعوت دین کا کام بڑے پیمانے پر ہوا، علمی، تعلیمی اور تربیتی نظام بہتر رہا۔ بہت سے دینی مکاتب قائم ہوئے، عصری و دینی درسگاہوں کا نظام مستحکم ہوا، ٹکنیکل تعلیم کے شعبے کھلے۔ مولانا سجاد اسپتال کو وسعت و ترقی ملی۔ مولانا منت اللہ رحمانی ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ، المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء اور وفاق المدارس الاسلامیہ بہار وغیرہ کا قیام عمل میں آیا۔

مولانا ملک کی آزادی و اتحاد کی تحریک کے شیدائی بھی رہے اور جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس راہ میں ان کو بڑی صعوبتیں اور مشقتیں بھی جھیلنی پڑیں۔

راقم الحروف کو گو مولانا کی زیارت و ملاقات کی کبھی سعادت میسر نہیں آئی، تاہم ان کے بعض اہل تعلق سے ان کی مقدس اور پاکیزہ زندگی، سیرت و کردار کی بلندی، ذکر و شغل اور ریاضت و مجاہدہ کی کثرت کے بارے میں جو کچھ سنا ہے اس سے ان کی عظمت و فضیلت کا نقشہ قلب پر مرتسم ہوگیا ہے۔ وہ بڑے ذاکر و شاغل، تہجد گزار صوفی منش بزرگ اور نہایت متواضع اور منکسر المزاج شخص تھے، ان کی زندگی سادہ اور درویشانہ تھی، کم سخن اور نرم گو تھے، خلوت و تنہائی زیادہ پسند کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس مقبول بندے کی مغفرت فرمائے اور ان کے خلا کو پر کرے۔ آمین۔

بہار و اڑیسہ میں امارت شرعیہ کا نظام اٹھہتر برس سے قائم ہے، اس سے وہاں کے مسلمانوں کو اسلامی شریعت کے مطابق زندگی گزارنے میں بڑی مدد مل رہی ہے، دنیا سرائے فانی ہے، یہاں موت سے کسی کو رستگاری نہیں۔ اب اس مفید و بابرکت نظام کی سربراہی کے لیے مولانا نظام الدین صاحب کا انتخاب عمل میں آیا ہے جن کو امارت کے

کاموں کا دیرینہ تجربہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے اور بہار واڑیسہ کے مسلمانوں کو سمع وطاعت کا اظہار کرتے ہوئے پورے اتحاد، ہم آہنگی اور اخلاص سے ان کے تعاون کی توفیق دے آمین!

## مولانا افتخار احمد فریدی

دینی حلقوں میں یہ خبر افسوس اور رنج کے ساتھ سُنی جائے گی کہ ۲۴ اکتوبر ۹۸ء کو ایک پُرجوش اور سرگرم داعی و مبلغ مولانا افتخار احمد فریدی انتقال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

مرحوم کا وطن مرادآباد تھا، ایک زمانے میں ان کے ہاتھوں میں وہ پرچم بغاوت تھا جس کو سرفروشان وطن نے برطانوی جبر واستبداد کے خلاف بلند کیا تھا مگر پھر ع پھاڑ کر جیب و آستیں کرعلم جنوں بلند۔ انہیں حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی دینی دعوت سے عشق ہوگیا جس کے لیے وہ ملکوں ملکوں کی خاک چھانتے رہے، کسی حادثہ میں ان کا ایک پیر کاٹ دیا گیا مگر وہ بیساکھیوں کے سہارے ملک کے طول وعرض کا دورہ کرتے رہے، سفرحج میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ کا ساتھ ہوگیا تو ان کی بڑی خدمت کی اور ہرطرح کا آرام پہونچایا۔ ایک دفعہ وہ اپنے ایک تبلیغی دورے میں اعظم گڈھ آئے تو شاہ صاحب نے ان کی بڑی پذیرائی کی۔ جناب سید صباح الدین صاحب سے مخلصانہ تعلق رکھتے تھے اور راقم سے بھی خط وکتابت رہتی تھی۔

کئی برسوں سے تبلیغی دوڑ دھوپ کا سلسلہ موقوف ہوگیا تھا لیکن اسی جذبے سے اصلاحی و دعوتی رسائل اور مواعظ وملفوظات کے مجموعے شایع کرتے تھے، وہ غیر مسلموں میں بھی اسلام کی تبلیغ واشاعت کرتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں سے



درگذر فرمائے اور انہیں جنت نعیم میں جگہ دے۔ آمین!

## حکیم محمد سعید

حافظ حکیم محمد سعید کے وحشیانہ اور بے رحمانہ قتل پر کون ہے جو تڑپا اور بے قرار نہ ہوا ہوگا، وہ بین الاقوامی شخص، مملکتِ خداداد کے ہمدرد و مسیحا، پاکستان کے معمار، اس کا مقدر چمکانے اور بنانے کے لیے فکرمند، ہمدرد فاؤنڈیشن کے سربراہ اور مدینۃ الحکمت کے بانی، عالم، مصنف، مدبر، عالی دماغ، سچے اور پکے مسلمان، قوم وملت کے بے لوث خادم، مخالف ہوا میں طب کا چراغ روشن کرنے، علم کو فروغ دینے، حکمت ومحبت کا خزانہ لُٹانے والے، غریبوں اور مصیبت زدوں کے درد وغم میں شریک، پہلو میں دردمند دل رکھنے، پاکستان کے تشویش انگیز حالات سے بے چین اور پریشان رہنے والے کو چند دقیقوں میں جن لوگوں نے موت کے گھاٹ اُتارا وہ بڑے خوں خوار، درندہ صفت اور انسانوں کے بھیس میں وحوش سے بھی بدتر لوگ تھے۔ آخر اس فرشتہ صفت، پاک دل، پاک باز، رحم ومروت کے پیکر، مجسم شرافت اور اخلاقی خوبیوں سے منور انسان کا قصور کیا تھا، ذوق مرحوم کے شاگرد محمد مظفر خاں گرم رامپوری کا وہ قطعۂ تاریخ وفات یاد آگیا جو نواب شمس الدین خاں مرحوم کو پھانسی دیے جانے پر کہا گیا تھا ؎

یہ دست درازیِ ستم کس سے بیاں ہو　　بے جرم وگنہ مسند نواب کو الٹا
تاریخ معمے میں نئی طرز سے لکھ، گرم!　　کیا چرخ نے "نوابی سہراب" کو الٹا

جو مملکت اُس اسلام کے نام پر وجود میں آئی تھی جو سراپا امن وسلامتی ہے اور جس کے آئین میں خون خرابہ اور قتل و دہشت گردی کی کوئی گنجائش نہیں اور جس کے

ماننے والے (مسلم) ساری دنیا کے لیے سراپا رحمت ہوئے ہیں، آج وہی مملکت جہنم کا نمونہ بنی ہوئی ہے، کراچی مقتل میں تبدیل ہوگیا ہے، پاکستان کے گلی کوچوں میں خونِ مسلم کی ارزانی ہے، وہاں کے در و دیوار سے تشدد و دہشت گردی پھوٹی پڑ رہی ہے، امن چین عنقا ہوگیا ہے، پُرامن شہریوں کی جان پر بن آئی ہے، خوف و دہشت کا یہ حال ہے کہ دن میں بھی لوگ اپنے گھروں سے نہیں نکلتے ؎

ایں چہ شوریست کہ در عہد قمر می بینم ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم

شروع ہی سے پاکستان میں انتشار، جارحیت اور سفاکی کی جو باد سموم چل رہی ہے اب اتنی تیز و تند ہوگئی ہے کہ حکیم محمد سعید جیسے شریف النفس اور بے ضرر انسان کو بھی خاک کے مانند اُڑا لے گئی، لیاقت علی خاں سے لے کر جنرل ضیاء الحق تک کتنے بے گناہ لوگ اسی کی نذر ہوچکے۔ اپنے محسنوں اور بے گناہ شہریوں کو تہہ تیغ کردینا اگر کسی قوم کا معمول بن جائے تو وہ کس طرح اپنی آزادی کو باقی رکھ سکے گی اور خود کب تک محفوظ رہے گی۔

شنبہ ۱۷ اکتوبر کو حافظ حکیم محمد سعید فجر کی نماز کے بعد حسب معمول آرام باغ کراچی کے اپنے مطب میں تشریف لے گئے تو اندھا دھند ان پر فائرنگ ہونے لگی اور وہ اپنے دو ساتھیوں سمیت شہید کردیے گئے، وہ روزے سے تھے، ہر شنبہ و یکشنبہ کو روزہ رکھنا ان کا معمول تھا، یہ خبر سنتے ہی سکتہ میں آگیا اور حکیم صاحب کا سراپا نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید مدظلہ، جو لقمان وقت اور کوہ ضبط و تحمل ہیں اور دوسرے عزیزوں کی تعزیت کس طرح کی جائے۔ حافظ حکیم محمد سعید کا آبائی وطن دہلی مرحوم تھا، ہیں ۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے، وہ اپنے پانچ



بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے اور ابھی طفل خورد سال ہی تھے کہ ۲۲ جون ۱۹۲۲ء کو ان کے والد بزرگوار حافظ حکیم عبدالمجید صاحب سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے، ان کی پرورش و پرداخت انکی والدہ ماجدہ اور بڑے بھائی حکیم عبدالحمید نے بڑی توجہ اور دلسوزی سے کی جو ان سے عمر میں ۱۳ سال بڑے تھے، حکیم محمد سعید اس کا اعتراف بڑی احسان مندی اور فخر سے کرتے تھے، اپنی والدہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہم سب کی ذمہ داری ابتداءً ہماری آپا (والدہ مرحومہ) پر رہی اور انہیں کی تربیت نے ہمیں وہ بنا دیا جو آج ہم ہیں، یہ خاتونِ محترم رابعہ منزلی تھیں... ابا جان سے انہوں نے تربیت اولاد کا گُر سیکھا تھا اور اس کا انتہائی صحیح استعمال کیا، انہوں نے کبھی اخلاق کی کسی کوتاہی کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا، اس بات میں وہ بڑی سخت گیر تھیں... توازن ان کا ہنر تھا، وہ اس توازن اور عدل کی وجہ سے پورے خاندان پر حکمراں تھیں، اگر ان میں یہ عظمتیں اور صلاحیتیں نہ ہوتیں تو ابا جان کے انتقال کے بعد ہمدرد باقی کہاں رہ سکتا تھا، ابا جان کی زندگی میں ہمدرد کے لیے آپا محترمہ نے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے... دیانت داری کی بات یہ ہے کہ میں نے اپنی آپا کی کوئی دوسری مثال آج تک نہیں دیکھی ہے۔"

اپنے "بھائی جان" کے تاعمر ممنون اور نیاز مند رہے، اپنے کو ان کی تربیت کا ثمرہ سمجھتے تھے ان کے سامنے بہت مودب رہتے، جب وہ دارالمصنفین تشریف لائے اور حکیم عبدالحمید صاحب قبلہ کے کمرہ میں ان کی چارپائی بھی بچھائی گئی، تو انہوں نے فرمایا کہ میں بھائی صاحب کے ساتھ کیسے رہوں گا، ایک جگہ لکھتے ہیں:

"عظمت ہمدرد کے لیے حکیم عبدالحمید نے ایک بڑا کام یہ بھی کیا ہے کہ مجھے انسان و ہمدرد بنا دیا، انہوں نے سرمایہ اسے قرار دیا کہ ہمدرد کے لیے ایسے لوگ تیار کیے جائیں جو ہمدرد کو

ہر حال میں سربلند اور سرفراز کر سکیں اور اس کو بقائے دوام دے سکیں میں ان کا
چھوٹا بھائی ضرور ہوں لیکن انہوں نے مجھے انسان سمجھا اور انسان کی تمام خوبیاں
مجھ میں پیدا کرنے کے لیے خود بڑی سے بڑی قربانی دے دی۔ اس اعتبار سے میرا
رواں رواں ان کے زیر احسان ہے"۔

وہ ساڑھے چھ برس کی عمر میں قرآن کریم ختم کر چکے تھے اور نو سال کی عمر میں اس کے
حافظ بھی ہو گئے تھے۔ اردو مادری زبان تھی، تیرہ برس کی عمر میں عربی فارسی سیکھ چکے تھے،
سن نے اور تجاوز کیا تو انگریزی کی شُد بُد بھی ہو گئی تھی۔

حکیم صاحب نے چودہ برس کی عمر تک پوری دلچسپی اور انہماک سے علم کی تحصیل کی اور
کبھی پڑھنے لکھنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی، مگر کھیل کود میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی، مرغ بازی،
کبوتر بازی، گھوڑ سواری، موٹر سائیکل دوڑ، گلی ڈنڈے، شطرنج، فٹ بال، کشتی رانی،
پہاڑوں پر چڑھنے، اکھاڑوں اور دنگلوں میں کشتی لڑنے کا بڑا شوق ہو گیا تھا، مگر حکیم عبدالحمید
صاحب نے اس موڑ پر ان سے سوال کیا کہ "اب کھیلنا ہے یا مزید کچھ پڑھ لکھ کر ہمدرد کے لیے
کام کرنا ہے"۔ اس سے چوکنا ہو کر انہوں نے تمام کھیل کود فی الفور بند کر دیے، ان کا رجحان طبع
صحافت کی جانب تھا تاکہ اس میدان کی بے راہ روی دور کر کے کچھ نئے نقش قدم قائم کریں
مگر ان کے بھائی جان کا فیصلہ تھا کہ "خاندان میں ہمدرد کا مقام اور مشن خدمت خلق بذریعہ
طب ہے، لہذا تعلیم طب لازم ہے"۔ اس کے سامنے سر تسلیم خم کر کے انہوں نے ۱۹۳۶ء میں
طبیہ کالج دہلی میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۹ء میں اس سے فارغ ہوئے۔

تحصیل طب کے زمانے ہی سے وہ اپنے بھائی جان کی رہنمائی میں ہمدرد کے کاموں
کی تربیت حاصل کرتے رہے۔ ابتدائی مرحلے میں دواخانے میں عطاروں کی مددگاری پھر



عطاری، نسخہ بندی اور دوا شناسی کی تربیت حاصل کی، دوا سازی کی تربیت کے لیے
بھٹیوں میں لکڑیاں اور کوئلے جھونکے، ہمدرد کی ڈاک، پارسل، پیکٹ تیار کرنے کی تربیت
ان کاموں کو انجام دینے والوں سے لی۔ طبیہ کالج سے فراغت کے بعد وہ صبح سے شام تک
ہمدرد کے مختلف دفاتر اور شعبوں میں کام کرتے اور شام کو اسی دواخانے میں بیٹھ کر
مطب کرتے تھے، جہاں عطاری کی تربیت حاصل کی تھی۔

ان مراحل سے گزرنے کے بعد ان کے بھائی جان نے بتدریج انہیں اختیارات
منتقل کرنا شروع کیا اور ۱۹۴۱ء میں انہیں سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا، اب وہ رات
دن کام کرتے تھے، چھ مہینے تک ہمدرد کی عمارت کے باہر نہیں نکلے، اس طرح بقول ان کے
"میری پوزیشن یہ تھی کہ ادارہ ہمدرد کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جہاں میں انتہائی مہارت سے
کام نہیں کر سکتا ہوں۔ دواؤں کی پیکنگ میں جب بیٹھتا تو بڑے سے بڑے ماہر کارکن
کو ہرا دیتا تھا، ہمدرد صحت ایک لاکھ چھپتا تھا، ہمدرد صحت کی ریپ کرنے بیٹھتا تو بڑے
سے بڑے دفتری مجھ سے ہار مان جاتے تھے، اردو ٹائپ کرنے بیٹھتا تو طوفان میل بن جاتا
تھا... ان کاموں میں اگر میں نے شکست کبھی کھائی ہے تو صرف بھائی جان قبلہ سے۔
وہ خود ہمدرد کا ہر کام اسی طرح کر سکتے ہیں اور کرتے رہے ہیں"۔

۱۹۴۱ء میں ان کا شعور پختہ اور ذہن بالغ ہو گیا تھا اور وہ صنعت و تجارت کے
اصول سے جو دیانت داخلاق میں مضمر ہے واقف ہو گئے تھے جس سے ان کے بھائی جان
نے انہیں دور نہ ہونے دیا۔

۱۹۳۷ء ہی سے ہمدرد صحت کی ادارت بھی ان کو تفویض کی جا چکی تھی جس سے
ان کے بھائی جان کو عشق تھا اور جو اس سے پہلے اس کے مدیر بھی رہے تھے، مگر

حکیم محمد سعید نے ۴۱ء میں اسے مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں لے کر چار چاند لگا دیا۔ ۴۴ء میں عارضی طور سے وہ بند ہو گیا تھا مگر ۴۸ء میں انہوں نے کراچی سے اسے جاری کیا۔

۴۰ء سے ۴۷ء تک حکیم محمد سعید اپنے بھائی جان کی سرکردگی میں ہمدرد کی عظمتوں میں اضافہ کرتے رہے، ان کا عزم یہ تھا کہ وہ فن طب کی آواز دنیا بھر میں پہونچا دیں، ملک کی تقسیم کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کی حکومت کا وہ دل سے احترام نہ کر سکیں گے، اس لیے دیانت و امانت کا تقاضا سمجھ کر وہ ۹ جنوری ۴۸ء کو دلی کی گلیاں چھوڑ کر پاکستان چلے گئے، ان کے جانے کا سب سے زیادہ ملال ان کے بھائی جان کو تھا جنھیں دلاسا دیتے ہوئے حکیم محمد سعید کے شفیق استاد قاضی سجاد حسین صاحب نے فرمایا "حکیم صاحب آپ آزردہ نہ ہوں، جب پاکستان میں مشکلات کے پہاڑ ٹوٹیں گے تو میاں سعید ضرور آجائیں گے"۔ شفیق استاد کے یہ جملے ان کے لیے چیلنج بن گئے، بڑی بے سروسامانی اور فلاکت کے باوجود وہ کراچی میں ہمدرد کا جھنڈا گاڑنے میں کامیاب ہو گئے، حکیم عبد الحمید نے ۱۹۳۵ء میں انہیں حفاظت طب اور ہمدرد کے لیے کام کرنے کی جو ذمہ داری سپرد کی تھی اسے کراچی پہونچ کر پوری ذمہ داری سے انجام دینے کا تہیہ کیا، ان کا خود بیان ہے کہ "پاکستان کا ہمدرد اس انداز سے شروع ہوا کہ میں ۹ جنوری ۴۸ء سے جون ۴۸ء تک کراچی کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہا اور دو وقت کھانے کو نہ تھا، لیکن ان کی مسلسل تگ و دو، عزم و حوصلہ اور غیر معمولی قوت عمل نے ہندوستان کے ہمدرد کی طرح پاکستان کے ہمدرد کو بھی عالمی شہرت کا حامل اور طبی و اسلامی تحقیقات کا عظیم الشان ادارہ بنا دیا۔

حکیم محمد سعید نے طب کے احیاء و ترقی اور دنیا بھر میں اس کی آواز پہونچانے کے لیے دنیا بھر کے اتنے سفر کیے کہ لوگ کہتے تھے کہ ان کے برابر ہوائی اور بحری و بری سفر تاریخ



میں کسی طبیب نے نہیں کیا ہے، وہ اپنی تحریروں میں اپنے سفر کی کثرت کا بار بار ذکر کرتے ہیں:

"گزشتہ کم از کم دس سال سے میری زندگی کا یہ عالم ہے کہ میں نچلا نہیں بیٹھا ہوں رات دن سفر میں ہوں، صبح پاکستان میں ہوں تو دن کو جرمنی میں، شام کو پیرس میں، میں کبھی لندن میں ہوتا ہوں، کبھی واشنگٹن میں، شام کو اگر ماسکو میں اٹھتا ہوں تو صبح تہران میں داخل ہوتا ہوں، ابھی میکسیکو میں ہوں تو دوسرے دن پورٹ آف اسپین میں۔ نیویارک سے اڑا تو صبح میڈرڈ میں داخل ہو گیا، کبھی بغداد اور مکہ، مدینہ میں ہوں تو اس سے اگلے دن حلب اور دمشق میں یا بغداد میں"۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"اب یہ حال ہے کہ میں ایک مہینے میں کئی کئی سفر کرتا ہوں، لاکھوں میل جاتا ہوں، دنیا کا کونا کونا میں نے چھان لیا ہے۔ دنیا کو کف دست بنا کر رکھ دیا ہے"۔

یہ سارے سفر وہ لطف و تفریح کے بجائے اپنے عظیم طبی مقصد اور مقدس مشن کی تکمیل کے لیے کرتے تھے۔ لکھتے ہیں "مگر میں نے ہر سفر احیائے طب کے مقصد عظیم کے لیے کیا ہے اور بھائی جان کے فیصلے کے عین احترام میں کیا ہے اور بالآخر میں نے اپنے مشن میں جو در حقیقت میرے عظیم بھائی کا مشن ہے، کامیابی حاصل کر لی۔ آج دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں کی خبر میں نے نہ لی ہو اور جہاں طب پر تحقیقی کام نہ ہو رہا ہو، الحمد للہ۔ سال گزشتہ میں فن لینڈ میں ایک کشتی لے کر کوئی آٹھ دن وہاں کے ہزار ہا جزیروں میں گھومتا رہا، تلاش یہ تھی کہ بڑے بڑے شہروں سے دور دراز جزیروں میں گم انسان اپنا علاج کن جڑی بوٹیوں سے کرتے ہیں، پھر بلغاریہ پہونچا تاکہ وہاں مفردات کے تحقیقی

کام کو دیکھوں، ماسکو گیا کہ وہاں سرطان اور جڑی بوٹیوں پر کام ہو رہا ہے، واشنگٹن میں اس موضوع کا جائزہ لیا۔

۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۶ء میں انہوں نے اپنے بھائی جان کے ساتھ جنوب مشرقی ایشیا اور یورپ کے ملکوں کے بھی مطالعاتی اور تجرباتی سفر کیے، ۵۶ء کا سفر کثیر المقاصد تھا، یورپ میں یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ طب و سائنس میں اس نے کیا پیش رفت کی ہے، دوا سازی میں کیا انقلابی کام ہو رہے ہیں، علمی سطح پر اہل علم و ادب کس انداز سے مصروف کار ہیں، عبادت گاہوں کا مقام یورپ میں کیا ہے وغیرہ۔ ان کے کثرتِ سفر اور مقاصدِ سفر کے بارے میں ان کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء تک میں نے دنیا کے اکثر ممالک کا مطالعاتی سفر کیا ہے، ان سفروں کی تعداد اتنی ہے کہ میں خود بھی یاد نہیں کر سکتا۔ میں نے ان سفروں میں خصوصیت کے ساتھ سائنس کے میدانوں میں شخصی روابط پیدا کیے ہیں اور ان کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہے، میرے اکثر و بیشتر سفر طب کے لیے ہوئے ہیں جس کے احیا و ترقی کی ذمہ داری ۱۹۳۵ء میں بھائی جان نے مجھے سونپ دی تھی اور میں نے اس ذمہ داری کو انتہائی حد تک پورا کر کے بھائی جان کے سامنے سرخ روئی حاصل کرنے کا فخر حاصل کیا ہے، یورپ میں طب کو تسلیم کرانے اور موضوعِ فکر بنانے اور آخر کار عالمی ادارۂ صحت سے طب کو تسلیم کرانے میں، میں نے دس سال مسلسل جد و جہد کی ہے، میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے فن طب اور صحتِ عالم کے لیے ایسا کام کر دیا ہے جس کے اثرات دور رس ہوں گے، انشاء اللہ العزیز الحکیم"۔

شریعت و طریقت کی اصل روح خدمت ہے، حکیم عبدالحمید کی طرح حکیم محمد سعید کی



زندگی کا یہی مشن تھا، اسی کے لیے انہوں نے میدانِ طب و حکمت میں قدم رکھا تھا اور اپنی سعی بلیغ سے اسے نئی زندگی دے کر عالمی سطح پر اسے باوقار بنا دیا، لیکن ان کی سرگرمیاں ہمدرد فاؤنڈیشن اور مدینۃ الحکمت اور ان کے مختلف و متعدد شعبوں کے قیام تک ہی محدود نہیں تھیں وہ ایک عالم، دانشور اور صاحبِ کمال مصنف بھی تھے، اردو اور انگریزی میں بے شمار کتب ان کی یادگار ہیں۔ کم لوگوں کو تحریر و تقریر دونوں کا ملکہ ہوتا ہے حکیم صاحب میں تقریر و خطابت کا ملکہ خداداد تھا۔ وہ اردو، عربی اور انگریزی زبانوں سے واقف تھے اور سب میں دل پذیر اور موثر تقریریں کرتے تھے۔

حکیم صاحب کی طبیعت میں بڑی بوقلمونی اور عجیب رنگا رنگی تھی، ایک طرف تو وہ احیائے طب کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھے اور اس کے لیے ملک ملک کی خاک چھانتے رہتے تھے، مگر ان کی یہ جہاں گردی اور بادیہ پیمائی اور ہمہ تن مشغولیت قلم و قرطاس اور تصنیف و تالیف میں مانع نہ بنتی، انہوں نے سینکڑوں کتابیں لکھیں جن میں کئی سفر نامے ہیں۔ ۱۹۳۶ء ہی سے روزنامچہ لکھنے کا معمول تھا، ہمدرد صحت کی ادارت کی ذمہ داری اس پر مستزاد، نونہال کی ادارت ان کے معتمد جناب مسعود احمد برکاتی کے سپرد تھی مگر اسکے صفحات پر بھی وہ موجود ہوتے، ہر شمارے میں پاکستان کے نونہالوں کو جاگنے اور جگانے کی تلقین بھی وہی کرتے تھے، افسوس ہے کہ ایسے جاگنے اور جگانے والے کو بھی بے رحموں نے ہمیشہ کے لیے سلا دیا۔

حکیم صاحب ایک فولادی انسان تھے جو برابر متنوع اور مختلف قسم کے کام کرتے رہتے تھے، وہ کبھی کام کرنے سے نہ تھکتے اور نہ گھبراتے تھے۔ بڑے اصول پسند اور مرتب شخص تھے، کھانے پینے کے معاملے میں نہایت محتاط تھے، ان کے مستعد، چاق و چوبند،

کارگزار، صحت مند اور تندرست ہونے کا سبب یہی تھا۔ اوقات و معمولات کے پابند
تھے اسی لیے ان کے کاموں میں بڑی برکت ہوئی اور قدرت نے ان سے مختلف النوع
کام لیے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ایک بار میں بھائی جان کے ساتھ تھانہ بھون گیا، حکیم الامت حضرت مولانا
اشرف علی تھانوی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے قدموں میں بیٹھنے کا شرف
حاصل کیا۔ ان کے بارے میں سنا تھا کہ وہ اس قدر پابند اوقات ہیں کہ لوگ ان کے
آنے جانے پر اپنی گھڑیاں ملا لیتے ہیں، میں نے یہ بات گرہ میں باندھ لی، پھر جب سے
میں عملی زندگی میں داخل ہوا ہوں تو اب میرا یہ حال ہے کہ میری نقل و حرکت پر لوگ واقعی
اپنی گھڑی درست کر لیتے ہیں، یہ بھائی جان محترم کی اعلیٰ تربیت کا ثمرہ ہے اور میں نے
اس سے بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔"

حکیم صاحب بڑے پاک طینت، شریف النفس، پاکیزہ صورت اور پاکیزہ سیرت
تھے، دیانت، امانت اور راست بازی ان کی سرشت تھی، خوش خلق، وضع دار، ملنسار
اور تکلف سے بری تھے، نہایت ہنس مکھ اور بڑے باغ و بہار شخص تھے، لوگوں سے
تپاک اور گرم جوشی سے ملتے، بڑوں کا احترام کرتے اور چھوٹوں پر شفقت فرماتے۔ جناب
سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم سے مخلصانہ تعلقات تھے، ان کی محبت انہیں دارالمصنفین
بھی کھینچ لائی، ان کے بھائی جان حکیم عبدالحمید صاحب اس کے رکن رکین ہیں، اس لیے
بھی اس سے بڑا تعلق رکھتے اور اپنی ایک ایک کتاب یہاں بھیجتے تھے، یہیں ان سے
پہلی بار ملاقات ہوئی، پھر ہمدرد نگر کے ایک بین الاقوامی سمینار میں ملا تو دیکھتے ہی
پہچان گئے، سمینار کئی روز تک چلتا رہا، جب جب ملاقات ہوتی تو سلام میں سبقت



لے جاتے، بڑی دل جوئی کرتے۔ باتیں اتنی دلچسپ کرتے کہ افسردہ اور ملول شخص بھی
خوش ہو جاتا، حرص و ہوس زر، زمین و جائداد کی محبت کبھی ان کے دل میں گھر نہیں
بنا سکی، کراچی میں انہوں نے اپنے لیے ایک انچ زمین نہ بنائی، بڑے پختہ عزم و ارادے
کے انسان تھے جس کام کو ٹھان لیتے وہ کر کے چھوڑتے۔

اذا ھم القی بین عینیه عزمه        ونکب عن ذکر العواقب جانبا

ان میں غرور، گھمنڈ اور پندار نام کو بھی نہ تھا، وہ بڑی شہرت و عظمت کے
مالک تھے، ان کو بڑے سے بڑے اعزاز ملتے رہے، پاکستان کے ممتاز ترین ایوارڈ
"ستارۂ امتیاز" سے نوازے گئے، سندھ کے گورنر ہوئے اور صدر مملکت جنرل
ضیاء الحق کے مشیر بنے مگر کبھی نہ آپے سے باہر ہوئے اور نہ ان میں رعونت و تمکنت
پیدا ہوئی، بلکہ جتنا بڑا عہدہ ملتا وہ ان کے انکسار اور فروتنی میں اور اضافہ کر دیتا۔
اللہ تعالیٰ ان کی بخشش فرمائے اور ان پر اپنے رحم و کرم کی بارش کرے۔ آمین!

"ض"

---

# مطبوعات جدیدہ

**روائح الاعلاق** از مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی، متوسط سے قدرے بڑی تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۸۵۵، قیمت درج نہیں، پتہ: ادارۂ تحقیقات و نشریات اسلام، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹، ندوۃ العلماء لکھنؤ، ۲۲۶۰۰۷۔

صاحب نزہۃ الخواطر مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کی تصنیفات و تالیفات میں احادیث شریفہ کا ایک مجموعہ تلخیص الاخبار ہے جس کو ان کے نامور فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے حکیم صاحب مرحوم کے خزینۂ مخطوطات و مسودات سے تلاش کیا، بعد میں بیروت میں یہ تہذیب الاخلاق کے نام سے شائع ہوا، امام نووی کی ریاض الصالحین کے طرز پر اعمال و اخلاق کے متعلق احادیث کا یہ انتخاب مقبول ہو کر کئی بار طبع ہوا، اب اس کی احادیث کی تخریج و تشریح اور تحشیہ و تعلیق کی مبارک و قابل ستائش سعی و کوشش دارالعلوم ندوۃ العلماء کے جواں سال فاضل و استاذ کے ذریعہ انجام پائی ہے، عرصہ سے ان کی یہ شرح ندوہ کے عربی ترجمان پندرہ روزہ الرائد میں شائع ہو رہی ہے اور اب زیر نظر کتاب کی شکل میں موجود ہے، انہوں نے ہر حدیث کے راوی کے ترجمہ کے بعد شرح حدیث، فقہ حدیث اور تخریج حدیث کے ذیلی عناوین کے تحت جس سلیقہ و مہارت سے یہ فریضہ انجام دیا ہے اس سے ان کے وسیع مطالعہ و تحقیق اور دیدہ ریزی و جاں فشانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ شروع میں فاضل محقق جناب ابو محفوظ الکریم معصومی کے قلم سے ایک مفید تحریر بھی ہے اور یہ گویا بہار کے علمائے حدیث کی جامع تاریخ ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مقدمہ سے بھی کتاب آراستہ ہے،



کتاب کا مفصل اشاریہ بھی لائق ذکر ہے جو جدید ترین معیار کے مطابق ہے، حسن طباعت اور التزام صحت میں بھی یہ نمایاں ہے، صرف ایک جگہ کمپوزنگ کی غلطی نظر آئی ص ۵۰۰ پر بجائے زینب بنت خزیمہ کے زینت چھپ گیا ہے، علم حدیث میں علمائے ہند کی خدمات کے سلسلۂ زریں میں یہ کتاب یقیناً عمدہ اضافہ ہے اور لائق شارح و محشی کے لیے لائق ستایش اور ان کے ادارہ کے لیے قابل فخر ہے۔

**اسلامی قوانین کی ترویج و تنفیذ** عہد فیروز شاہی کے ہندوستان میں، از جناب ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، صفحات ۱۵۰، قیمت ۷۵ روپے، پتہ: پبلیکشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

عہد وسطیٰ کے اسلامی ہند میں تغلق سلاطین کا دور مہمات فوجی و ملکی اور استحکام سیاسی کے علاوہ ہندوستان میں مضبوط و مستقل اسلامی معاشرہ کے قیام کے لحاظ سے بھی اہم ہے، اس نقطۂ نظر سے اس عہد کے مطالعہ کی خاص اہمیت کے باوجود اس پر توجہ کم کی گئی، زیر نظر کتاب کی تالیف میں یہی احساس کارفرما ہے کہ اول تو جدید مورخین اس عہد کی تاریخ کے ان پہلوؤں کو اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں مزید ستم یہ کہ جدید مسلم دانشور اہل قلم بھی اس جانب کم توجہ دیتے ہیں، چنانچہ فاضل مصنف نے خاص فیروز شاہ تغلق کے عہد میں شریعت اسلامی تعلیمات اور فقہ و قانون اسلامی کے نفاذ و ترویج کی مساعی کا محققانہ جائزہ لے کر چھ ابواب میں مختلف عنوانوں کے تحت مفید معلومات یکجا کر دیے ہیں، ان میں فتاویٰ فیروز شاہی اور غیر مسلموں سے تعلقات اور ہندوؤں سے سلطان کے معاملہ اور برتاؤ کے مباحث خاص طور پر قابل ذکر ہیں، لائق مصنف کو فقہ اور عہد سلطنت سے خاص مناسبت ہے، اس سے پہلے بھی اس موضوع پر وہ اردو اور انگریزی میں مضامین اور کتابیں سپرد قلم کر چکے ہیں، یہ کتاب بھی تحقیق و تجزیہ میں انکی محنت و اصابت رائے کا عمدہ نمونہ ہے، ان مباحث کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں انگریز اور انکے زیر اثر بعد کے دوسرے مورخین کی غلط بیانیوں کی مدلل تردید بھی کی گئی ہے۔

**بری عادتیں، نقصانات، تدارک** از جناب حکیم محمد مختار اصلاحی، متوسط تقطیع،

عمدہ کتابت وطباعت صفحات ۴۴ قیمت ۱۰۰ روپے پتہ: اسلامی دواخانہ فیضی محل محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳ اور اعجاز پبلشنگ ہاؤس ۲۸۶۱، کوچہ چیلان دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

اس کتاب کے بزرگ مصنف طب و حکمت میں حذاقت و مہارت کے علاوہ موضوعات طب پر اپنی مفید تحریروں کے لیے معروف ہیں، موجودہ انسانی معاشرہ کو اخلاقی امراض و معادات قبیحہ کی کثرت نے جس طرح اذیت ناک اور بےجان بلب کر دیا ہے اس سے متاثر ہو کر انہوں نے ان سے نجات و شفایابی کے بڑے قیمتی نسخے اس کتاب کے ذریعہ پیش کر دیے ہیں، بےایمانی، بےراہ روی، والدین کی نافرمانی، غیبت و بہتان، اوہام پرستی، فخر و غرور، سود و رشوت، شراب و منشیات، سینما، ٹی وی، بےپردگی، بےشرمی، قتل اولاد، بیکاری، ریکارڈ بجانے کا خبط وغیرہ تیس سے زیادہ موضوعات پر ان تحریروں میں دردمندی و اخلاص نے بڑا اثر پیدا کر دیا ہے، زبان بھی سلیس و سادہ ہے۔

**حرف حرف** از جناب ستیہ پال ملھوترہ عارف، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت مناسب، صفحات ، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: ستیہ پال ملھوترہ عارف ۱۱/۱۷۰۰ کوچہ بوہڑ والا، کٹڑہ باگھ سنگھ، امرتسر ۱۴۳۰۰۶۔

جناب ستیہ پال عارف کے بلند اور پاکیزہ خیالات نے ان کے کلام کو واقعتاً صداقت و معرفت کے اوصاف سے آراستہ کر دیا ہے، ان کی شاعری میں پختگی کی وجہ یہ ہے کہ اس کا سفر اس وقت شروع ہوا جب ان کا کاروان حیات نصف سے زائد مسافت طے کر چکا تھا، عرفان ذات و عرفان حقیقت کے عنوان سے ان کی ابتدائی نظم و غزل بلکہ تمام کلام اسی معرفت کا غماز ہے:

شعور و آگہی عارف کو بخشی تیری رحمت نے — مرے اشعار میں حسن معانی ہے عطا تیری

کیا وہ لمحہ تھا ازل کا ہم نے جذب شوق میں — بوجھ سر پر لے لیا جو تا ابد ڈھوتے رہے

جناب کالی داس گپتا رضا اور جناب پورن سنگھ ہنر کی تحریریں بھی کتاب میں شامل ہیں، ان کے اس جذبہ میں ہم بھی شریک ہیں کہ:

ان کا کچھ کہنا ہمیں اچھا لگا — حرف حرف ان کا ہمیں اچھا لگا



## دار المصنفین کا سلسلہ تذکرہ و سوانح